غلامی اور نسل پرستی

ڈاکٹر مبارک علی

فہرست

تعارف

تاریخ میں یہ ہوتا رہا ہے کہ ایک ادارہ وجود میں آتا ہے اور کسی ایک طبقہ، جماعت، اور گروہ کے مفادات کو پورا کرتا ہے۔ اور پھر جب اس کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو وہ آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اور تاریخ میں صرف اس کا ذکر رہ جاتا ہے۔ اس لئے یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ایسے اداروں۔ روایات۔ اور قدروں کے مطالعہ کی کیا ضرورت ہے جو اپنی افادیت، ضرورت ختم کر کے ختم ہو گئیں اور ماضی میں روپوش ہو گئیں؟ کیا ان کا تاریخی مطالعہ ہماری سوچ، فکر اور شعور میں اضافہ کرے گا؟ اور کیا ان کا علم ہمارے حال کے لئے مفید ہو گا؟ یہ سوال غلامی کے ادارے کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ جو دنیا کی تہذیبوں میں اپنا کردار ادا کر کے انیسویں صدی میں ختم ہو گیا جب تک اس ادارے کا وجود تھا اس کے بارے میں زیادہ غور و فکر کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور اسے فطری سمجھتے ہوئے یہ سمجھ لیا گیا کہ غلاموں کا مقدر خدمت کرنا ہے اور قدرت نے کچھ کو غلام بننے کے لئے پیدا کیا ہے اور کچھ کو حکم چلانے کے لئے۔ اس لئے اگر اس نظام میں دخل دیا گیا تو یہ نظام فطرت میں دخل اندازی ہو گی کہ جس سے دنیا کے نظام کا توازن بگڑ جائے گا اس لئے جو چیز جہاں ہے اسے وہیں رہنے دیا جائے اور چھیڑا نہیں جائے۔

لیکن تاریخ کا سبق یہ ہے کہ نہ تو کوئی ادارہ لافانی ہے اور نہ روایات و اقدار اٹل اور ابدی ہے۔ معاشرے بدلتے رہتے ہیں اور ان کے ساتھ نئی اقدار، روایات پیدا ہوتی

رہی ہیں۔ لیکن یہ ایک اہم سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ ادارے یا روایات کیوں بدلتے ہیں؟ کیا اس تبدیلی کے پس منظر میں انسانی ہمدردی ہوتی ہے، اخلاقیات کا دخل ہوتا ہے، یا ان کا سبب مفادات، اور وہ بھی معاشی مفادات ہوتے ہیں کہ جو اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ان کا سہارا لیتے ہیں۔

وہی کچھ غلامی کے ساتھ ہوا کہ جب حکمراں طبقوں کو اس کی ضرورت تھی تو اس وقت مذہبی، اخلاقی اور انسانی بنیادوں پر اسے جائز قرار دیا جاتا رہا۔ اور اسے ایک ایسی ضرورت قرار دیا کہ جو معاشرہ کے استحکام اور ترقی کے لئے ضروری تھی لیکن جب یہ ادارہ معاشی طور پر بوجھ بننے لگا اور اس سے پیداوار میں رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں تو غلامی کو ختم کرنے کے لئے مذہبی و اخلاقی اور انسانی جذبات پیدا ہو گئے اور وہ غلام جو اب تک مشین، اور کم تر انسان سمجھے جاتے ہیں وہ یکدم سچّی انسان ہو گئے کہ جن میں دوسرے انسانوں کی طرح جذبات و احساسات تھے۔

ان ختم ہو جانے والے اداروں کا مطالعہ تاریخ میں اس لئے اہم ہو جاتا ہے کہ یہ ان اثرات کا جائزہ لیتی ہے کہ جو یہ ادارے چھوڑ گئے ہیں غلامی تو ختم ہو گئی مگر غلامی سے آزاد ہونے والے افراد کو معاشرے میں مساوی مقام حاصل کرنے کے لئے کس قدر مراحل کا سامنا ہوتا ہے جس کی مثال امریکہ ہے کہ جہاں افریقہ سے زبردستی لائے ہوئے غلام آزاد تو ہو گئے۔ مگر امریکی جمہوریت میں انسانی مقام حاصل کرنے کے لئے انہیں کس قدر جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے۔ کیونکہ غلامی کے آثار ان کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ ان تعصبات کو ختم کرنا اس وقت ان کے لئے سب سے بڑی مشکل ہے۔ یہ ایک طویل اور کٹھن راستہ ہے کہ جس سے گزر کر وہ اپنا جائز مقام حاصل کریں گے۔

تاریخ میں اس لئے غلامی کے ادارے کا تجزیہ ضروری ہے۔ کہ تاکہ اس پورے تاریخی عمل کی نشان دہی کی جائے کہ جس کی وجہ سے غلامی پیدا ہوئی۔ اور پھر اس کا اخلاقی جواز تلاش کیا گیا۔ اس کے بعد ان کے اس کردار کی نشاندہی ضروری ہے کہ جس

کی وجہ سے دنیا کی ترقی اور تہذیب و تمدن کے عروج میں انہوں نے حصہ لیا، اس سے دو سبق ملتے ہیں۔ ایک اس ناانصافی کی نشان دہی ہوتی ہے کہ جو غلاموں کے ساتھ روا رکھی گئی۔ اور دوسرے دنیا کو ان کا احسان مند ہونا پڑتا ہے کہ انہوں نے قربانی دے کر اپنی محنت و مشقت سے ہر بڑی تہذیب کو آگے بڑھانے میں حصہ لیا۔

اس لئے اگر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس صورت میں نسلی تعصب و ناانصافی جو آج تک ان کی نسلوں کے ساتھ روا رکھی جا رہی ہے اس کا خاتمہ ہو سکے گا اور انہیں معاشرہ میں مساوی مقام مل سکے گا۔

غلامی اور نسلی تعصب کا سب سے بڑا شکار افریقہ کے لوگ رہے ہیں۔ کیونکہ رنگ کی بنیاد پر نسل پرستی کے خاتمہ کے لئے ذہن کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ انسان اور قومیں اپنی زبان بدل لیتی ہیں کلچر بدل لیتی ہیں مگر اپنا رنگ نہیں بدل سکتیں، اس لئے اس بنیاد پر ان کے ساتھ زیادتیاں ہوتی ہیں، اور سفید اقوام اس رنگ کی نسل پرستی کی بنیاد پر ان کا مسلسل استحصال کئے ہوئے ہیں۔ یہاں بھی تاریخی معلومات اور تاریخی حقائق ان تعصبات کو ختم کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔

نسل پرستی اور غلامی کا تعلق امپیریل ازم سے بھی ہے یورپی اقوام نے جب ایشیا، افریقہ، امریکہ، آسٹریلیا، اور نیوزی لینڈ میں اپنی نوآبادیات قائم کیں تو انہوں نے "خالص سفید نسل" کے نظریہ کو اپنے استحصال کا ذریعہ بنایا۔ اس نظریہ کے تحت غیر سفید اقوام جسمانی و ذہنی طور پر سفید اقوام سے کم تر تھیں، اس لئے یہ ان کا حق تھا کہ وہ ان پر حکومت کریں اور ان ملکوں کے ذرائع کو استعمال کریں۔

تاریخ کی یہ ستم ظریفی ہے کہ خود یورپ میں نازی ازم نے سفید اقوام میں آریہ نسلی برتری کے نظریہ کو فروغ دیا اور اس کی بنیاد پر جرمنی نے یورپ کے ملکوں کو فتح کر کے وہاں اپنا اقتدار قائم کرنا شروع کیا۔ اگرچہ نازی ازم کو یورپ میں شکست ہوئی۔ مگر نسل پرستی کے جذبات یورپ کی اقوام میں بدستور باقی رہے۔ خصوصیت سے جنوبی افریقہ میں
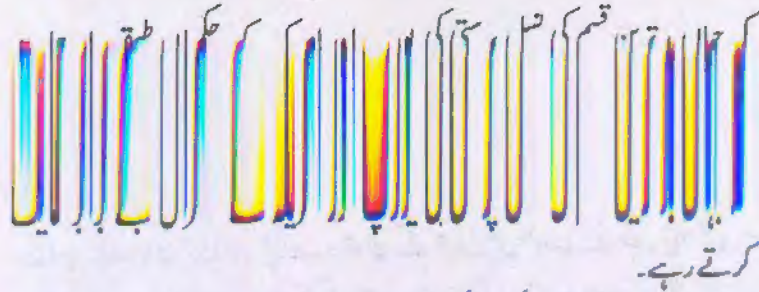
کرتے رہے۔

نسل پرستی کے جذبات کسی نہ کسی شکل میں دنیا کی ہر قوم میں موجود ہوتے ہیں۔ ہر قوم اپنی خصوصیات اور کردار کو اپنی خاص نسل کی وجہ قرار دیتی ہے اور اس بنیاد پر اسے دوسری اقوام میں بڑی کمزوریاں نظر آتی ہیں۔ اقوام میں نسلی برتری اور کم تری کا احساس اسی وقت ہوتا ہے جب ان کا رشتہ فاتح اور مفتوح کا ہو جاتے۔ ورنہ ہر قوم اپنی ثقافت، تہذیب، روایات اور اداروں کو دوسروں سے افضل سمجھتی ہے۔ اسی لئے فتح مند اقوام ان کے اعتماد کو توڑنے کے لئے سب سے پہلے ان کی ثقافت اور تہذیب پر حملے کر کے انہیں ذہنی طور پر بنجر بناتی ہیں۔ ہندوستان میں جب انگریز بحیثیت تاجر کے آئے تو وہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن سے بڑے متاثر ہوتے اور انہوں نے ان کی ثقافت کو اختیار بھی کر لیا۔ مگر جیسے جیسے ان کا سیاسی اقتدار بڑھتا گیا۔ ایسے ایسے وہ ہندوستانی کلچر چھوڑتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے لئے یہ لازمی ہو گیا کہ وہ ہندوستانی کلچر کو تباہ کر کے یورپی کلچر کو یہاں نافذ کریں تاکہ مفتوح لوگ ذہنی طور پر ان کے غلام ہو جائیں۔ ان کی اس پولیسی کے اثرات اس قدر گہرے تھے کہ نوآبادیات کے عوام سیاسی طور پر آزاد ہونے کے باوجود اب تک ثقافتی اور تہذیبی طور پر ان کے غلام ہیں۔

نسلی جذبات صرف اقوام ہی میں نہیں ہوتے بلکہ یہ طبقوں اور خاندانوں میں بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں سید، پٹھان، مغل یا شیخ کی ذاتیں انہیں نسلی تصورات پر ہیں کیونکہ ان میں جو ذاتیں مراعات یافتہ تھیں، وہ اپنی ذات کو محدود کر کے اپنی اعلیٰ حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتی تھیں۔ اس لئے آج تک اعلیٰ وکم تر ذاتوں کا نظریہ ہمارے معاشرے میں بہت مقبول ہے۔ اور اس کی وجہ سے معاشرہ میں اتحاد کا ہونا ایک مشکل عمل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کوئی اعلیٰ ذات والا کم تر سے کسی قسم کے سماجی اور

معاشرتی تعلقات رکھنے پر تیار نہیں ہوتا۔

اگرچہ ہم مغرب کے سفید اقوام کو نسل پرست کہتے ہیں۔ مگر نسل پرستی کے جذبات خود ہمارے ہاں بڑے گہرے ہیں۔ سفید اور کالا رنگ ہمارے سماجی درجہ کو متعین کرنے میں اب تک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہمارے خوبصورتی اور بدصورتی کے معیار بھی اس نسلی تعصب پر ہیں۔ بالوں اور آنکھوں کا رنگ خوبصورتی کے اعلیٰ وادنیٰ معیار مقرر کرتا ہے۔ اس نسلی تعصب کی جڑیں انگریزوں کے آنے سے بہت پہلے ہماری تاریخ میں ہیں کہ جب آریہ اور دراوڑ اقوام کا تصادم ہوا۔ اور جو قومیں بھی وسط ایشیا ایران وافغانستان سے آئیں وہ اس نسلی تعصب کو اپنے ساتھ لائیں۔ المیہ یہ ہے کہ اس جدید زمانہ میں بھی ہمارے ہاں اس پر شرمندہ ہونے کی بجائے اس پر فخر کیا جاتا ہے۔

نسل کی بنیاد پر استحصال چاہے قوموں کے درمیان ہو یا معاشرے کے طبقوں اور ذاتوں کے درمیان، یہ دونوں صورتیں ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔ نسلی برتری کی اقوام اپنے سے کم تر اقوام کو تعلیم و تربیت کے مواقع نہ دے کر انہیں ایسے کاموں میں مصروف رکھتی ہیں کہ جہاں وہ محض محنت و مزدوری کریں اور ان میں کسی قسم کا شعور نہ پیدا ہو۔ اس کی مثال جنوبی افریقہ ہے کہ جہاں سیاہ فام باشندوں کو صرف بطور کان کن، کھیت مزدور اور محنت کش کے استعمال کیا جاتا ہے۔

یہی صورت حال اعلیٰ ذاتوں والے کرتے ہیں کہ نچلی ذاتوں کو جاہل رکھ کر اور ان سے آگے بڑھنے کے تمام مواقع چھین کر ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان دونوں صورتوں میں معاشرہ کی اکثریت اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو بھرپور طریقہ سے استعمال نہیں کر سکتی اور وہ ترقی میں پیچھے رہ جاتی ہے۔

نسلی تعصب کے خلاف جہاد کرتے ہوئے ضروری ہے کہ انسان خود اپنے اندر چھپے ہوئے نسلی جذبات کو نکال پھینکے، صرف اسی وقت وہ اس جنگ کو کامیابی سے لڑ سکتا ہے۔

غلامی اور معاشرہ

دنیا کی تمام بڑی بڑی تہذیبوں میں غلامی کا رواج رہا ہے، یہ غلام جنگ میں پکڑے جانے والے قیدی ہوتے تھے یا وہ لوگ جنہیں غلامی کا کاروبار کرنے والے دوسرے علاقوں سے اغوا کر کے یا زبردستی پکڑ کر فروخت کرتے تھے۔ ان کے گاہکوں میں بادشاہوں سے لے کر امراء ہوا کرتے تھے جو غلاموں کو اپنے گھریلو کاموں، اپنے حفاظتی دستوں اور اپنے کارخانوں کے لئے استعمال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب غلامی کا ادارہ قائم ہوگیا اور اس سے حکمراں طبقوں کے مفادات وابستہ ہو گئے تو ہر دور کے مذہب اور اخلاقی اقدار نے اس ادارے کی اہمیت پر زور دیا اور اس کے وجود کو انسانی ضرورتوں کے لئے جائز قرار دیا۔

چونکہ غلام نجی جائداد کے زمرے میں آتے تھے اس لئے ان کی حیثیت ملکیت کی ہوتی تھی اور نجی جائداد کے تقدس اور حفاظت کو ہر زمانہ اور عہد میں بالائی طبقوں کے مفادات میں جائز اور ضروری سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس لئے غلاموں کے انسانی درجہ کو گھٹا کر اسے محض جائداد کا ایک بے جان حصہ سمجھ لیا گیا تھا کہ جس پر اس کے مالک اور آقا کے پورے پورے اختیارات تھے کہ وہ جس طرح چاہے اس کے ساتھ سلوک کرے اور اسے استعمال کرے۔ اسی لئے ایک غلام کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اس
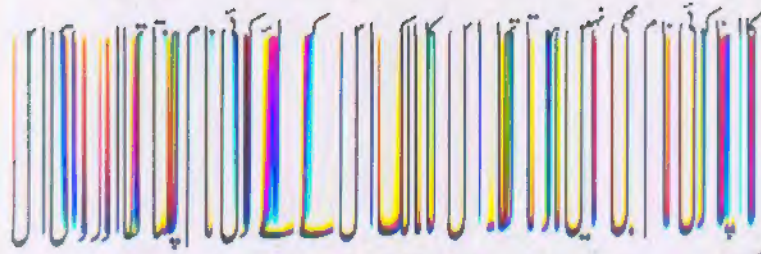
کی شناخت بن جاتا تھا۔ اس لئے اگر کوئی غلام بار بار فروخت ہوتا تھا تو اسی طرح سے اس کے نام بھی بدلتے رہتے تھے۔

اگر کوئی غلام آزاد ہو جاتا تو اس کے نتیجہ میں ایک بے جان شے کی حیثیت سے اس کا تبادلہ ایک جاندار شخص کی صورت میں ہوتا تھا اور اس کی پہچان بحیثیت انسان کے ہونے لگتی تھی۔ لیکن یہ ایک ایسی تبدیلی تھی کہ جو بہت کم غلاموں کی قسمت میں لکھی ہوتی تھی ورنہ دوسری صورت میں وہ گمنام، خاموش اور حسرتوں و محرومیوں کو لئے اس دنیا سے ختم ہو جاتے تھے۔

غلامی اور امپیریل ازم کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ جب بھی کوئی قوم متحد ہوئی اور اس نے کمزور ہمسایہ ملکوں پر حملہ کر کے وہاں سے مال غنیمت لوٹنا شروع کیا تو اس مال میں سونا، چاندی اور سامان کے ساتھ ساتھ انسان بھی بطور غلام لائے جاتے تھے، چنانچہ جب فاتحین کی افواج واپس لوٹتی تھیں تو ان کے ہمراہ غلاموں کی بھی فوج ہوا کرتی تھی جو بطور انعام فوج میں تقسیم کئے جاتے تھے اور منڈیوں میں فروخت ہوتے تھے۔ غلاموں کی کثرت اور آسانی سے ان کی دستیابی کا اثر ان معاشروں پر زبردست پڑا اور اس کی وجہ سے ان کے سماجی رویے بدل گئے۔

اول تو وہ اقوام یا قبائل کہ جن کے لوگوں کو غلام بنا کر لایا جاتا تھا ان کے لئے فاتحین کے دلوں میں کوئی عزت نہیں رہتی تھی۔ وہ غلاموں کی نسل بن کر اپنا سارا احترام کھو دیتی تھی۔ دوئم چونکہ ان غلاموں میں عورتوں کی بھی بڑی تعداد ہوتی تھی اور ان عورتوں کو جنسی طور پر استعمال کیا جاتا تھا اس لئے ان معاشروں میں عورتوں کی حیثیت گرتی چلی گئی اور ان کے حقوق کو پامال کیا جاتا رہا۔ سوئم، خصوصی طور پر جب افریقی لوگوں کو غلام بنایا گیا تو ان کے رنگ کی وجہ سے ان کو ممتاز کر کے ان کے لئے حقارت کے الفاظ استعمال کئے گئے جن کی وجہ سے رنگ کی نسل پرستی پیدا ہوئی اور کالے و

گورے کا فرق قائم ہوا۔ چہارم، حکمراں طبقوں میں سستی و کاہلی پیدا ہوئی اور انہیں جسمانی آرام و آسائش کا چسکہ پڑا، کیونکہ اب ان کے ہر کام کے لئے گھریلو غلاموں کی بڑی تعداد ہوتی تھی۔ پنجم غلاموں کی بہتات سے اس معاشرے کے غریب، کچلے ہوئے اور مفلس لوگوں پر یہ اثر پڑا کہ ان کے کام کاج اور ملازمت کے مواقع کم ہو گئے ور اس وجہ سے ن میں اور حکمراں طبقوں میں وسیع خلیج حائل ہو گئی۔ چونکہ وہ اپنے غلاموں سے حقارت سے پیش آتے تھے اس لئے ان کا رویہ عوام کے ساتھ بھی یہی ہو گیا کہ وہ ان کے ساتھ رعونت اور درشتگی کے ساتھ پیش آنے لگے اور ان کے دلوں میں عوام کے لئے کوئی عزت و احترام نہیں رہا۔ ششم، غلامی کی وجہ سے زبان پر بھی اثر پڑا کیونکہ ان غلاموں کو بغیر کسی احترام اور عزت کے مخاطب کیا جاتا تھا اس لئے ان سے خطاب کرتے ہوئے ادب، آداب اور نرمی و شائستگی کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا مثلاً یونانی اور لاطینی زبانوں میں انہیں چاہے ان کی عمر کوئی ہو لڑکا کہا جاتا تھا (سندھ میں زمیندار اپنے ملازموں کو چاہے ان کی عمر کچھ بھی ہو چھورا یا چھوکرا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں) اس کے پس منظر میں یہ ذہنیت تھی کہ ان غلاموں کی حالت وہی ہے جو ایک ناسمجھ، ناپختہ لڑکے کی ہوتی ہے، اس لئے زبان میں طبقاتی فرق اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔

ان غلاموں سے حکمران طبقوں نے ہر قسم کے کام لئے مثلاً ان سے کھیتی باڑی کرانی شروع کر دی یا انہیں معدنیات کی کانوں میں بطور مزدور استعمال کیا یا ان غلاموں سے جو دست کاری اور کسی صنعت میں ماہر تھے کارخانوں میں بطور ہنرمند و دست کار کام کرایا اور اکثر حالتوں میں انہیں افواج میں رکھ کر دشمن کے خلاف لڑوایا۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے حالات تھے اور کون سی وجوہات تھیں کہ یہ غلام اپنے آقاؤں کے احکامات ماننے پر مجبور ہوتے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ ایک مرتبہ جب انہیں قیدی بنا کر یا اغوا کر کے لایا جاتا تھا تو ان کا وہ تعلق جو ان کے قبیلہ، قوم یا جماعت سے ہوتا تھا وہ ٹوٹ جاتا تھا، اس پر مزید یہ کہ وہ اپنے

ماحول، علاقہ اور وہاں کے ثقافتی اثرات سے بالکل کٹ جاتا تھا اس لئے اس کی ذات عدم تحفظ، غیر یقینی اور انجانے خوف سے گھری ہوتی تھی اس لمحہ وہ اپنی بقاء اور زندگی کے لئے اس پر آسانی سے تیار ہو جاتا تھا کہ اپنے آقا کی خدمت کرے۔ اس کی اطاعت کرے۔ اس کے ساتھ وفادار رہے کیونکہ اس کے بدلے میں اسے زندگی اور اپنی بقا کی امید تھی اس لئے اس سودے کے بدلے وہ اپنی آزادی و حقوق دینے پر تیار ہو جاتا تھا اور اس میں یہ احساس کم ہی ہوتا تھا کہ اس کا استحصال ہو رہا ہے۔

استحصال کا احساس اسے اس وقت ہوتا تھا کہ جب وہ غلاموں کے کسی گروہ اور جماعت کے ساتھ کسی کھیت، کان، فوج یا کسی ایسے کام میں مصروف ہو کہ جہاں اسے دوست اور ہمراہی مل جائے اور اس پر مزید یہ کہ ان پر سختی و تشدد کیا جائے اور ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام لیا جائے صرف ان صورتوں میں یہ یا تو فرار ہونے کا منصوبہ بناتے تھے یا بغاوت کرتے تھے۔

اسی وجہ سے غلاموں کی نگرانی کے لئے اور ان کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھنے کے لئے لوگ متعین ہوتے تھے اور ان کے روز مرہ کے معمولات کو ایک ڈسپلن کے تحت کنٹرول کیا جاتا تھا۔ ان کے ہر کام کے اوقات مقرر تھے اور انہیں یہ احساس دلایا جاتا تھا کہ ان پر ہر وقت نظر رکھی جا رہی ہے تاکہ ان کے دلوں میں خوف اور ڈر باقی رہے اور انہیں اپنی اجتماعی طاقت کا احساس نہ ہو۔ اکثر انہیں کام کے اوقات یا سفر کے وقت زنجیروں سے باندھ دیا جاتا تھا۔ جو حکم عدولی کرتے تھے یا کام میں سستی کرتے تھے انہیں سخت سزائیں دی جاتی تھیں تاکہ اس سے دوسروں کو عبرت ہو۔ عبرت اور سبق کی خاطر اکثر سخت جرم کرنے والوں کو موت کی سزا بھی دے دی جاتی تھی جو کہ آقا کے لئے مالی طور پر نقصان دہ ہوتی تھی مگر اس نقصان کو اس لئے برداشت کیا جاتا تھا تاکہ غلاموں میں اطاعت اور وفاداری قائم رہے اور وہ بغاوت و حکم عدولی کے بارے میں سوچیں بھی نہیں۔

رومی سلطنت میں یہ قانون تھا کہ اگر کوئی غلام اپنے آقا کو قتل کر دے تو اس کے بدلے میں اس کے گھر میں جتنے غلام ہوتے تھے وہ اس جرم میں قتل کر دئے جاتے تھے مشہور رومی مورخ ٹے سی ٹس (Tacitus) نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ 61 ء میں ایک غلام نے اپنے رومی آقا کو اس کے خراب رویہ، تشدد اور بد تمیزی کی وجہ سے قتل کر دیا چنانچہ رومی قانون کے تحت وہ تمام غلام کہ جو ایک ہی چھت کے اندر تھے ان کے قتل کا حکم ہوا۔ ان میں مردوں کے علاوہ عورتیں اور بچے بھی شامل تھے اور ان کی تعداد تقریباً چار سو کے قریب تھی۔ اس پر شہر میں ہنگامہ ہوا اور عوام نے اس سزا کے خلاف احتجاج کیا لیکن رومی سینٹ نے اس سزا کو برقرار رکھا اور انہیں فوج کی نگرانی میں قتل کیا گیا۔ اس سزا کو برقرار رکھنے میں رومی امراء اور حکمراں طبقوں کا مفاد یہ تھا کہ اگر سزا نہیں دی گئی تو پھر کسی کی جان بھی محفوظ نہیں رہے گی۔ اس لئے اپنی جان اور جسمانی تحفظ کے لئے انہوں نے چار سو معصوم غلاموں کی جان لے لی۔

اگرچہ اس رویہ کے خلاف غلاموں کی بغاوتیں بھی ہوئیں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اکثریت نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور غلامی کی ایک ایسی ذہنیت کو پیدا کیا کہ جس میں مزاحمت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اور آقا کو خوش کرنے کے لئے جو حربے استعمال کئے ان میں خوشامد، اس کی جھوٹی تعریف، اس کی ہر بات کو صحیح ماننا، اس کی ہاں میں ہاں ملانا شامل تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنی بقا کے لئے اپنی ذات کو قربان کر دیا۔ وہ ہر وقت اور ہر لمحہ آقا کی خدمت کے لئے تیار رہتا تھا۔ چاہے دن ہو یا رات اس کے اپنے کوئی اوقات نہیں تھے۔ اس کا جسم اور اس کی توانائی سب آقا کے لئے تھی۔ اس کی اپنی کوئی خوشی اور غمی نہیں تھی۔ اس کے تمام جذبات کا تعلق اس کے مالک اور آقا کی ذات سے تھا اور یہ وہ غلامانہ ذہنیت تھی کہ جس نے آگے چل کر آزاد اور غریب عوام کو بھی مجبور کیا کہ وہ غلاموں کی روایات پر چلیں اور حکمران طبقوں کی خوشنودی کے لئے خود کو قربان کریں اور غلامانہ ذہنیت کو اختیار کریں۔

دوسری تہذیبوں کے مقابلہ میں اسلامی تہذیب میں غلاموں کے ساتھ اس قدر برا سلوک نہیں ہوا۔ خاص طور سے وہ غلام جو گھریلو کام کاج کرتے تھے وہ خاندان کا ایک حصہ ہو جاتے تھے اور انہیں کافی مراعات مل جاتی تھیں۔ کنیزیں کہ جن سے مالک کے جنسی تعلقات ہوتے تھے ان کی اولاد اس کی جائداد میں برابر کی شریک ہوتی تھی اور اس طرح دوسری نسل غلامی سے آزاد ہو جاتی تھی۔ اکثر حکمراں کنیزوں کی اولاد سے تھے جن میں سب سے مشہور عباسی خلیفہ مامون ہے۔ یہ ضرور تھا کہ کنیز زادہ ہونے کی وجہ سے اس کا سماجی مرتبہ گھٹ جاتا تھا مگر اس کی صلاحیتوں کی وجہ سے اس کے راستہ کی مشکلات کم ہو جاتی تھیں۔ عثمانی خاندان کے تمام بادشاہ یلدرم کے بعد سے کنیزوں کی اولاد تھے کیونکہ وہ شادی نہیں کرتے تھے اور کنیزوں سے تعلقات رکھتے تھے۔

حکمرانوں اور امراء کے خاندانوں میں جو باصلاحیت غلام ہوتے تھے ان کے لئے ترقی کے مواقع تھے اور بعض حالات میں تو آقا اپنی لڑکی کی شادی کر کے اسے اپنا داماد بنا لیتا تھا۔ غوری سلطان معزالدین کے بارے میں تو مشہور ہے کہ وہ اپنے غلاموں کو اپنے لڑکوں کی طرح سمجھتا تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس کے غلام ہی اس کی سلطنت کے وارث ہوئے اور یہ اسلامی معاشرہ کا ایک مثبت پہلو ہے کہ اس میں غلام حکمران حکمرانی تک پہنچے۔ ہندوستان میں خاندان غلاماں اور مصر میں مملوک خاندان اس کی مثالیں ہیں۔

ہر تہذیب میں غلاموں کی موجودگی کی وجہ سے ان کے بارے میں قوانین بنائے گئے تاکہ جو سماجی و معاشی مسائل پیدا ہوتے تھے ان کو قانونی طور پر حل کیا جائے۔ اسلامی فقہ میں بھی غلامی کے بارے میں قوانین ہیں اور ساتھ میں ہدایات بھی کہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے اور اگر انہیں آزاد کر دیا جائے اس سے زیادہ ثواب نہیں چنانچہ جرائم اور گناہوں کے کفارہ کے طور پر غلاموں کو آزاد کرنے کا کافی ذکر ہے۔

اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ جب عباسی خلفاء کمزور ہوئے اور انہیں عربوں کی حمایت نہیں رہی تو خلیفہ المتوکل نے سب سے پہلے ترک غلاموں کی ایک فوج

تیار کی کہ جو خلیفہ کے مخالفین کو کچل سکے۔ اسلامی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ غیر ملکیوں کو اپنے ہی لوگوں کے خلاف استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد آنے والے خلفاء نے بھی اس روایت کو قائم رکھا مگر جیسے جیسے خلفاء کمزور ہوتے گئے ترک غلاموں کی فوج طاقت ور ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ وہ اپنی مرضی سے خلیفہ کو تخت پر بٹھاتے اور ہٹاتے تھے پوری مملکت میں ان کی وجہ سے انتشار پیدا ہو گیا تھا۔

اسی صورت حال سے عثمانی خلفاء بھی دو چار ہوتے انہوں نے بھی اپنے غلاموں پر مشتمل بے نیچری فوج کی تشکیل دی تھی جو ان لوگوں پر مشتمل ہوتی تھی کہ جنہیں بچپن میں مشرقی یورپ سے لایا جاتا تھا اور محل میں ان کی پرورش کی جاتی تھی۔ ابتداء میں یہ فوج حکمراں کی وفادار رہی مگر جب سلطنت کمزور ہوئی تو انہوں نے سیاسی طور پر فوجی قوت کی وجہ سے طاقت حاصل کر لی اور سیاسی انتشار یہاں تک پہنچا کہ آخر کار ان کا قتل عام ہوا اور غلاموں کا یہ فوجی ادارہ ختم ہوا۔

ہندوستان میں بھی خاندان غلاماں کے عہد میں ترکی غلاموں نے جو امراء کے درجہ تک پہنچ گئے تھے امیران چہل گانہ کے نام سے سیاسی انتشار پھیلایا یہاں تک کہ بلبن نے جو کہ خود ایک غلام تھا اور امیران چہل گانہ میں شامل تھا' ان امراء کو ختم کیا۔

چنانچہ غلاموں نے جہاں کسی تہذیب کے پھیلاؤ میں مثبت کردار ادا کیا وہاں ان کی وجہ سے معاشرے اور اقوام زوال پذیر بھی ہوئیں۔ اس لئے کچھ مورخین کا خیال ہے کہ رومی سلطنت کے زوال کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے امراء نے کھیتی باڑی کا کام غلاموں کے سپرد کر دیا تھا جس کی وجہ سے کسان بے روزگار ہو کر ہجوم میں شامل ہو گئے کہ جو ہنگامہ کرنے کے لئے ہر موقع کو استعمال کرتے تھے اور بد امنی پھیلاتے تھے۔ اور کھیتی باڑی کا کام غلاموں کے ہاتھوں میں جانے کے بعد اچھا نہیں رہا' پیداوار میں کمی آنی شروع ہو گئی اور اسی نے آگے چل کر اقتصادی بحرانوں کو پیدا کیا۔

ایک عرصہ تک مورخوں نے غلاموں کے مثبت کردار کی طرف توجہ نہیں دی کہ ان

کی وجہ سے تہذیب و تمدن نے کیوں کر ترقی کی؟ غلاموں کی وجہ سے معاشرہ کے حکمراں طبقوں کو جو فرصت اور آسائش کے لمحات میسر آتے انہیں استعمال کرتے ہوتے انہوں نے ادب اور آرٹ میں تخلیقی اضافے کئے۔ اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوتے اینگلز نے اپنی مشہور کتاب اینٹی ڈیورنگ (ANTI-DUEHRING) میں لکھا ہے کہ غلامی کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ زراعت اور صنعت کی تقسیم کا سلسلہ عمل میں آیا۔ اگر غلامی نہیں ہوتی تو کسی یونانی ریاست کا وجود نہیں ہوتا، اور نہ ہی یونانی آرٹ اور سائنس وجود میں آتے۔ اگر غلامی نہیں ہوتی تو کوئی رومی امپائر تشکیل نہیں ہوتی اور بغیر یونانی تہذیب اور رومی سلطنت کے جدید یورپ کا وجود نہیں ہوتا۔

انیسویں صدی میں یورپ میں قدیم تہذیبوں میں خصوصیت سے یونانی اور رومی ادوار میں غلامی کے ادارے پر تحقیق ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب یورپ میں غلامی کے خلاف تحریک چل رہی تھی اور اسے ایک انسانیت سوز جرم مانا جارہا تھا۔ جمہوری اقدار کے فروغ نے مساوات کے اصول کو مقبول بنانے میں مدد دی تھی اور ساتھ ہی میں عیسائی مذہب کی انسان دوستی، ہمدردی، اور محبت کے اصولوں سے تاریخ کو جانچا اور پرکھا جارہا تھا۔ کچھ مورخ مارکس و اینگلز کے نظریات سے متاثر ہو کر تاریخ کی از سر نو تشکیل کر رہے تھے اور انہوں نے تاریخ میں پیداوار کے لحاظ سے جو ادوار مقرر کئے تھے ان میں دور غلامی بڑا اہم تھا۔

بہرحال اس زمانہ میں غلامی کے سلسلہ میں جو تحقیق ہوئی اس کا اہم پہلو یہ تھا کہ اب تک مورخوں نے اس ادارے کو نظر انداز کر رکھا تھا اور اس کی ابتداء، استحکام، اور معاشرہ پر اس کے اثرات کا تجزیہ نہیں کیا تھا۔ اب انیسویں صدی کے مورخوں نے غلامی کے ادارے کی اہمیت کو سمجھتے ہوتے اس کے سیاسی، معاشی اور سماجی پہلوؤں کا جائزہ لیا، اس تحقیق کے نتیجے میں جو نتائج سامنے آتے وہ یہ تھے۔

۱۔ یہ صحیح ہے کہ غلامی کا ادارہ انسانیت کے خلاف تھا اور اس نے معاشرہ کو

غیر مساوی بنیادوں پر تقسیم کیا لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ یونان کے حکمراں طبقوں نے جو کلچر پیدا کیا وہ غلامی کے ادارے کی وجہ سے ممکن ہوا اور اگر اس کے بدلہ میں دنیا کو اتنا زرخیز، اعلیٰ اور پختہ تمدن مل جاتے تو یہ سوچنا پڑے گا کہ کیا اس کی قیمت غلامی کی صورت میں صحیح اور جائز تھی؟

۲۔ جن مورخوں نے غلامی کے مسئلہ کو عیسائیت کے نقطہ نظر سے دیکھا ان کے لئے اس سوال کا جواب مشکل تھا کہ عیسائیت نے اپنے عروج کے زمانہ میں کیوں غلامی کو برقرار رکھا اور اسے ختم کرنے کی کوشش نہیں کی؟ اس کا ایک جواب یہ دیا گیا کہ اس وقت غلامی نجی جائداد کی حیثیت رکھتی تھی اور ریاست کے لئے یہ ادارہ ایک ضرورت تھا اس لئے عیسائیت نے بھی اسے برقرار رکھا اور اسے تبدیل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے لئے اخلاقی جواز فراہم کر کے اسے مزید مستحکم کیا۔

۳۔ یہ نقطہ نظر کہ تاریخ میں عہد قدیم سے لے کر موجودہ دور تک جو اصول معاشرہ میں رہا ہے وہ غیر مساوی طبقاتی تقسیم ہے اور اس کے بغیر کسی معاشرہ نے استحکام حاصل نہیں کیا۔ اس غیر مساوی تقسیم سے معاشرہ میں حکم چلانے والے اور اطاعت کرنے والے دو طبقے پیدا ہوتے ہیں مگر اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ ان دو کے درمیان توازن کو کیسے برقرار رکھا جائے؟ اس لئے قدیم تہذیبوں میں غلامی کے ادارے کو کہ جو محکوم افراد پر مشتمل تھا ان کو حاکموں نے کیسے استعمال کیا؟ اس لئے ان سوالات کا جواب ڈھونڈنے کی ضرورت ہے کہ یہ ادارہ وجود میں کیسے آیا؟ اس کے فائدے اور نقصانات کیا تھے؟ مورخوں نے غلامی کے ادارے کے وجود میں آنے کے عمل کی جو نشان دہی کی ہے وہ یہ کہ ابتدائی دور میں مرد نے عورتوں اور بچوں کو پیداوار کے لئے استعمال کیا لیکن جب معاشرہ میں زراعت پھیلی تو اسے اس کے لئے اور زیادہ کام کرنے والوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مگر یہ کام کرنے والے صرف جنگ، لوٹ مار اور زبردستی کے ذریعہ ہی مل سکتے تھے یا انہیں خریدا جا سکتا تھا چنانچہ ایسے لوگ ذاتی غلام بن گئے جو کہ

مالک کے خاندان کا قبضہ تھے۔ اس ادارے میں اس وقت تبدیلی آئی جب کہ شہروں میں آبادی بڑھی، لوگوں کا معیار زندگی بلند ہوا، زندگی میں آرام و آسائش آنا شروع ہوئی۔ طوائفوں کی مانگ ہوئی، اعلیٰ عمارتیں، قیمتی زیورات، اور ساز و سامان کی بہتات ہوئی تو اس نے غلامی کی ضرورت کو بڑھایا اور اس کے نتیجہ میں ذاتی غلاموں کے بجائے کلاسیکل غلامی پیدا ہوئی جس نے پیداوار کے عمل کو بڑھایا۔ اس پورے عمل میں معاشرہ نے ذہنی طور پر غلامی کے ادارے کو ضرورت سمجھ کر جائز تسلیم کر لیا۔

۴۔ غلامی کے فائدے اور نقصانات دونوں ہی تھے۔ فائدہ یہ کہ اس نے سستی مزدوری فراہم کی اور مزدوری کی کمی کا جو مسئلہ تھا اسے حل کر دیا لیکن اس کے نقصانات یہ تھے کہ غلاموں کی بغاوتوں اور فرار نے غیر یقینی کی فضا پیدا کی، معاشرہ کے ڈھانچہ کو غیر مستحکم کر دیا۔ روشن خیالی اور علم کو روک دیا سماجی طور پر ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ میں جانے کے عمل کو کمزور کر دیا۔ ریاست، خاندان کے اقتدار کے مقابلہ میں کمزور ہو گئی اور ان کے مفادات کا تحفظ کرنے لگی۔

قدیم غلامی کے مسئلہ پر بیسویں صدی کے مورخین نے بھی کام کیا مگر جس مسئلہ کی طرف اس زمانہ میں زیادہ توجہ ہوئی وہ افریقہ کے لوگوں کی غلامی اور ان کا امریکہ میں استعمال تھا جس کا موجودہ دور کی تہذیب و ثقافت پر گہرا اثر ہوا۔

افریقہ اور غلامی

دنیا میں سب سے زیادہ غلامی کی اذیت سے دوچار ہونے والا براعظم افریقہ رہا ہے۔ ابتداء ہی سے افریقی غلاموں کی دنیا بھر میں مانگ تھی اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان کا رنگ اور ان کی جسمانی ساخت حیرانگی کا باعث ہوگی اور وہ لوگ کہ جن کے پاس ذاتی غلام ہوا کرتے تھے وہ اپنے سماجی مرتبہ کو اور زیادہ بڑھانے کے لئے افریقہ کے غلاموں کو خصوصی طور پر خریدتے تھے تاکہ ان کے نوادرات میں یہ بھی شامل ہوں۔

مشرقی وسطی اور برصغیر ہندوستان میں افریقی غلاموں کی کافی مانگ تھی اور یہ فوج میں حفاظتی دستے سے لے کر حرم کی حفاظت کرنے والوں میں شامل ہوتے تھے۔ بلبن نے کہ جو خاندان غلاماں کا مشہور بادشاہ گزرا ہے جب منگولوں کی ایک سفارت کا استقبال کیا تو اس نے خصوصیت سے افریقی غلاموں کے فوجی دستہ کو اس طرح سے آراستہ کیا کہ ان کے جسم کے بالائی حصہ کو برہنہ رکھا اور انہیں چمکدار تلواریں دیں جو سورج کی روشنی میں کالے و سفید رنگ کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کر رہی تھیں اور دیکھنے والوں کے دلوں پر اس منظر سے ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔

ہندوستان میں کچھ افریقی غلاموں نے بڑی شہرت حاصل کی ان میں خصوصیت سے جنوبی ہندوستان کا ملک عنبر ہے۔ جس نے جہاں گیر کے عہد میں مغلوں سے جنگیں کر کے انہیں بڑا پریشان کیا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں بمبئی کے قریب جنجرہ کے علاقے
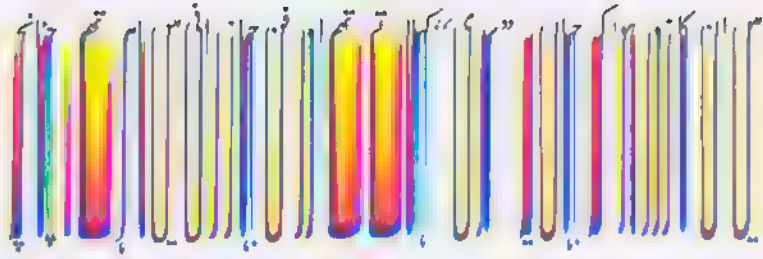
یورپی اقوام کے خلاف اورنگ زیب نے ان میں سے ایک کو امیرالبحر بنا دیا تھا کہ جس نے بہت سی بحری جنگوں میں یورپی اقوام کو شکستیں دیں تھیں۔ ہندوستان میں چونکہ ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی اس لئے یہ یہاں کے معاشرے میں مل گئے اور ان کی علیحدہ سے کوئی شناخت نہیں رہی۔

مگر سندھ میں اب تک افریقہ کے غلاموں کی یادگار شیدی لوگ باقی ہیں۔ یہ لوگ خصوصیت سے زنجبار کے علاقے سے سندھ میں لائے جاتے تھے اور یہاں امراء کے ہاتھوں فروخت کئے جاتے تھے۔ ان میں سے اکثر کئی خاندان سندھ کے میروں کے ہاں اب تک بطور ملازم نسلوں سے ان کی خدمت کر رہے ہیں۔ چونکہ ان کی تعداد کافی ہے اور یہ آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں اس لئے انہوں نے اپنی علیحدہ سے شناخت قائم رکھی ہے اور ان میں اب تک افریقی کلچر کی علامات دیکھی جا سکتی ہیں جن میں رقص اور گانا خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سندھ میں کچھ ایسے گاؤں ہیں جو شیدیوں کے ہیں یہاں پر رات کو ڈھول کی تھاپ پر رقص کرتے شیدی آج بھی اپنا رشتہ اپنے بچھڑے ہوئے وطن سے ملاتے ہیں۔

لیکن افریقیوں کا بحیثیت غلام سب سے زیادہ استحصال یورپیوں نے کیا۔ ابتداء میں تو یورپیوں نے افریقہ کو نو آبادیات میں تبدیل کرنا شروع کیا تاکہ اس کے نیچرل ذرائع کی لوٹ کھسوٹ کی جائے اور اس مقصد کے تحت انہوں نے اپنی مقبوضات میں ترقیاتی کاموں کو شروع بھی کیا مگر جیسے ہی نئی دنیا کی دریافت ہوئی اور وہاں انہیں زیادہ مواقع کی امید ہوئی تو انہوں نے افریقہ کی مقبوضات کو ترقی دینے کے تمام منصوبے ترک کر دئے اور اپنی تمام تر توجہ اس مقصد پر صرف کی کہ نئی دنیا کے ذرائع کو کیسے حاصل کیا جائے اور انہیں کیسے استعمال کیا جائے۔؟

ابتداء میں پرتگیزی اور ہسپانوی جو امریکہ گئے انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ

وہاں سے جس قدر سونا چاندی اور قیمتی معدنیات مل سکیں انہیں اپنے ملکوں میں لے آئیں۔ اس لئے جیسے جیسے وہ علاقوں پر قابض ہوتے چلے گئے وہ مقامی باشندوں کو اس پر مجبور کرتے رہے کہ انہیں زیادہ سے زیادہ سونا مہیا کریں۔ سونا حاصل کرنے کی لالچ میں انہوں نے مقامی باشندوں پر تشدد کیا، انہیں اذیتیں دیں، ان کا قتل عام کیا اور ان کے صدیوں سے جمع شدہ خزانوں کا صفایا کر دیا اور سونے و چاندی سے بھرے جہازوں کو اپنے ملک بھجوا دیا۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا کہ ان کے پاس سے سونا چاندی ختم ہو گیا۔

لہٰذا اس کے بعد استحصال کا جو دوسرا دور شروع ہوا اس میں انسانوں کو ختم کر کے زمینوں پر قبضہ کرنا تھا لیکن ان خالی زمینوں سے اس وقت تک کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ انہیں استعمال میں نہیں لایا جائے چنانچہ انہوں نے اول تو اس بات کی کوشش کی کہ مقامی باشندوں ہی سے کانوں میں کام کرا کے معدنیات نکلوائیں اور ان سے کھیتوں میں کام کرا کے فصلیں تیار کرائیں مگر اس میں دقت یہ پیش آئی کہ ایک تو اس عرصہ میں قتل عام اور یورپی بیماریوں سے مقامی آبادی بے انتہا گھٹ گئی اور ان کی تعداد اس قدر نہیں رہی کہ وہ انہیں متوثر طریقے سے استعمال کر سکیں۔ جب انہوں نے غریب اور ضرورت مند یورپیوں کو بطور مزدور استعمال کرنا چاہا تو اس میں بھی انہیں ناکامی ہوئی کیونکہ وہ کام کی زیادتی اور کم آمدنی کی وجہ سے بھاگ جاتے تھے اور انہیں دوبارہ کام پر واپس لانا مشکل ہوتا تھا۔ ان حالات میں یورپی اقوام نے جو نئی دنیا میں اپنے قدم جما چکے تھے، یہ فیصلہ کیا کہ افریقہ سے غلاموں کو برآمد کر کے ان سے زمینوں پر کام کرایا جائے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جائے۔

یہاں پر یہ سوال ہوتا ہے کہ آخر انہوں نے افریقہ کو ہی کیوں منتخب کیا اور دوسرے ملکوں کی جانب کیوں توجہ نہیں دی؟ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ اس وقت افریقہ ان براعظموں میں سے تھا کہ جہاں قبائلی نظام عام تھا اور ان کا معاشرہ منظم نہیں
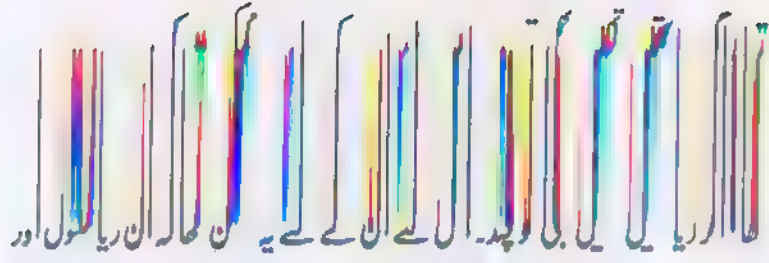
[illegible] میں بھی [illegible]۔ اس لئے ان کے لئے یہ ممکن تھا کہ ان ریاستوں اور افریقی تاجروں کی مدد سے قبائلیوں کو پکڑ کر لایا جائے اور انہیں غلام بنایا جائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے افریقی غلاموں کو اس لئے بھی ترجیح دی کہ یہ جسمانی طور پر سخت اور مضبوط تھے اور بہت سی بیماریوں سے مبرا تھے۔ جب کہ ان کے مقابلہ میں دوسری اقوام کے لئے نئی دنیا کی آب و ہوا میں بیمار ہو کر مرجانے کا خطرہ تھا۔ پھر افریقہ نسبتاً نئی دنیا کے قریب تھا اور غلاموں کو وہاں لے جانے پر زیادہ اخراجات نہیں آتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ افریقہ میں غلام سستے اور کافی مقدار میں مل جاتے تھے۔

افریقہ سے غلاموں میں اکثر تعداد مردوں کی لے جائی گئی کیونکہ انہیں معدنیات کی کانوں، کھیتی باڑی، صنعت و حرفت و کارخانوں میں کام کرنے کے لئے ایسے مردوں کی ضرورت تھی کہ جو جسمانی طور پر سخت ہوں اور کام کی زیادتی کو برداشت کر سکیں۔ چونکہ ان کے ساتھ بہت کم عورتیں جاتی تھیں اس لئے ان کی آبادی میں اضافہ نہیں ہوتا تھا اور غلاموں کے مرجانے سے ان کی تعداد میں کمی ہوتی رہتی تھی اس لئے غلاموں کی مستقل ضرورت رہتی تھی جو خالی جگہ کو پر کرتے رہیں اور اسی وجہ سے افریقہ سے مسلسل غلاموں کو خرید کر لایا جاتا رہا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۸۲۰ء تک تقریباً ۱۰ سے ۱۱ ملین افریقی بطور غلام نئی دنیا لائے گئے۔

غلاموں کی اس قدر بڑی تعداد کے جانے کی وجہ سے افریقہ کی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ مثلاً افریقہ کے مغربی ساحلی علاقوں سے زیادہ تر مرد غلاموں کو پکڑ کر لے جایا گیا جس کی وجہ سے ان علاقوں میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہو گئی، جب کہ اس کے مقابلہ میں سوانا اور ہورن کے علاقوں سے عورتوں کی اکثریت کو مشرقی ممالک میں فروخت کیا گیا جس نے یہاں مردوں کی تعداد کو بڑھا دیا۔ آبادی کے اس توازن کے بگڑنے کی وجہ سے شادی بیاہ اور دوسرے سماجی رشتوں میں بگاڑ پیدا ہوا اور نتیجتاً معاشرہ کے سماجی ادارے تباہ ہو گئے۔

یہاں پر یہ ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ افریقی غلاموں کی جو مشرق اور مغرب میں تجارت ہوتی آخر میں اس کے نتائج ان دونوں جگہوں پر مختلف نکلے کیونکہ مشرق اور مغرب کی غلامی کی وجوہات علیحدہ علیحدہ تھیں۔ مغرب میں جسمانی طور پر طاقت ور مردوں کی ضرورت تھی جو مشقت اور محنت مزدوری کر سکیں جب کہ مشرق میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی زیادہ مانگ تھی اور یہ عورتیں بطور بیگمات، داشتاؤں اور خادماؤں کی حیثیت سے گھروں میں رہیں۔ ان کی اولاد غلام نہیں رہی بلکہ بطور آزاد افراد کے انہیں معاشرہ میں مقام مل گیا۔ اس لئے غلاموں کی یہ آبادی معاشرہ میں گھل مل کر جلد ہی ختم ہو گئی جس کی وجہ سے یہ ایک مستقل ادارہ نہیں رہا۔

جب کہ امریکہ میں غلام غلام ہی سے شادی بیاہ کر سکتے تھے اور ان عورتوں سے بھی کہ جن کے سفید مردوں سے تعلقات تھے۔ ان کی اولاد مخلوط کہلائی اور ان کا سماجی رتبہ نہیں بڑھ سکا۔ اس لئے امریکہ میں غلامی کی جڑیں انتہائی مضبوط رہیں اور معاشرہ میں ان کے اور آزاد باشندوں کے درمیان فرق قائم رہا۔

اور یہ ایک حقیقت ہے کہ افریقہ میں غلاموں کی اس تجارت میں صرف سفید اقوام کے تاجر ہی ملوث نہیں تھے بلکہ اس میں خود افریقی تاجر اور افریقہ کی ریاستوں کے حکمران اور امراء بھی شریک تھے اور ان کی مدد کے بغیر یورپی اقوام کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اس وسیع پیمانہ پر غلاموں کو افریقہ سے لے جائیں۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر افریقیوں نے کیوں اس کو محسوس نہیں کیا کہ وہ اس تجارت کے ذریعہ خود کو نقصان پہنچا رہے ہیں؟ اس کا جواب اس وقت کے افریقی معاشرہ کی پس ماندگی میں نظر آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکے تھے کہ ان کے اس عمل سے افریقہ کو سماجی اور سیاسی طور پر اور معاشی لحاظ سے بھی نقصانات ہوں گے۔ آبادی کے ایک صحت مند اور مضبوط حصہ کو بطور غلام لے جانے سے افریقہ پر جو اثرات ہوں گے شعور کی کمی کے باعث یہ اس کا اندازہ نہیں لگا سکے۔ اس کے علاوہ

افریقی معاشرہ اس قدر بکھرا ہوا، ٹوٹا ہوا اور کمزور تھا کہ ان کے پاس ایسے کوئی سماجی دباؤ نہیں تھے کہ جن کی مدد سے وہ اس عمل کو روک سکیں اور نہ ہی ان کے پاس معاشی دباؤ تھے کہ یہ غلامی کے معاشی مضمرات کو ختم کر سکتے۔ اس کے علاوہ ان کے لئے غلامی کا مسئلہ کوئی اخلاقی مسئلہ نہیں بنا اور لوگوں کو غلام کے طور پر فروخت کرتے ہوئے ان کے ضمیر نے کسی قسم کی ملامت نہیں کی۔

اس کے برعکس یورپی اقوام جو افریقیوں کے مقابلہ میں زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ تھیں۔ انہوں نے معاشی فوائد کے لئے غلامی کے اخلاقی جواز تلاش کر لئے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ افریقی غیر مہذب، جاہل اور جانوروں کی سطح کے لوگ ہیں اس لئے ان کے ہاں نہ تو کوئی تہذیب ہے اور نہ ثقافت، اس لئے ایسے لوگوں کو بطور غلام استعمال کرنا اخلاقی لحاظ سے کوئی برائی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر ان لوگوں کو غلام نہیں بنایا جائے گا تو دوسری صورت میں یا تو یہ آپس میں لڑ جھگڑ کر اور باہمی جنگوں میں ختم ہو جائیں گے یا قحط اور خشک سالی ان کی آبادی کا صفایا کر دے گی۔ اور ایک عام تصور یہ بھی دیا گیا کہ افریقیوں کے پاس چونکہ کچھ کرنے کو نہیں ہوتا ہے اس لئے یہ کام چور، سست اور کاہل ہوتے ہیں لہذا اس صورت میں انہیں بطور غلام استعمال کرنا برا نہیں ہے۔

اگر ان لوگوں کو غلام بنا کر ان سے کام لیا جائے تو یہ ایک صحت مند اقدام ہو گا۔ چونکہ ان کے کام کے نتائج زیادہ پیداوار، تجارتی ترقی اور معاشرہ کی خوش حالی کی صورت میں نکلیں گے۔

اگرچہ یورپی اقوام نے غلامی کا اخلاقی جواز تلاش تو کر لیا مگر اس کی وجہ سے جو ظلم ہوئے، جو ناانصافیاں ہوئیں اور جس کے نتیجہ میں افریقی اور یورپی و امریکی معاشرے متاثر ہوئے اس کا جائزہ لینے کی بھی ضرورت ہے، لیکن افریقیوں کو انسانیت کے درجہ سے گرا کر اور ان سے گندے و سخت کام کرا کے اہل مغرب نے انہیں دنیا کی نظروں

میں پس ماندہ بنادیا۔ نسل پرستی کے جذبات کہ جن کی بنیاد نفرت اور انسان دشمنی پر تھی انہیں پروان چڑھایا۔ ان کی جڑیں اس قدر گہری ہوئیں کہ آج تک رنگ کی بنیاد پر نسل پرستی مغربی و امریکی تہذیب کا ایک حصہ بنی ہوتی ہے اور وہ ذہنی طور پر اس قدر ترقی کرنے کے باوجود اس سے نجات نہیں پا سکے ہیں۔

یہاں تک کہ افریقی اور ایشیائی مزدوروں کے ساتھ وہ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں کہ جیسے ماضی میں وہ غلاموں کے ساتھ کر چکے تھے۔

غلامی کی وجہ سے دنیا کی تاریخ میں افریقہ کی جو تصویر ابھر کر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسا براعظم ہے کہ جہاں ماضی میں اور آج بھی کبھی تہذیب و تمدن رہا ہی نہیں اور یہ لوگ جنگلوں میں جانوروں کی طرح زندگی گزارتے تھے۔ اگر انہیں مہذب بنایا تو مغرب نے۔ ان نظریات کی وجہ سے افریقہ کا دنیا کی تاریخ میں اپنا مقام گر گیا اور اس کی پہچان اب غلامی، نسل پرستی اور نوآبادیاتی حکومت کی وجہ سے ہے۔

لیکن ان منفی اثرات کے ساتھ ساتھ خود افریقہ اس دردناک اذیت کے عمل سے اپنی ایک شناخت کے ساتھ ابھرا ہے اور اس نے اس کے بکھرے ہوئے، ٹوٹے ہوئے اور علیحدہ علیحدہ حصوں کو ملا کر ایک کر دیا ہے۔ اب افریقی اپنے افریقی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ ان میں ہم آہنگی کا احساس بڑھ گیا ہے اور متحدہ افریقہ سے ان کا تعلق ہو گیا ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ افریقہ کی یہ جو تصویر تاریخ میں بنی ہے اسے تبدیل کریں اور دنیا کی تاریخ میں افریقہ نے جو حصہ لیا ہے اسے نمایاں کریں۔

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ افریقہ کی غلامی نے دنیا کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے اسے اجاگر کیا جائے۔ کیونکہ اب تک دنیا کی ترقی کے ذکر میں یا مغرب اور امریکہ کی ترقی میں صرف یورپی اقوام کا تذکرہ ہوتا ہے اور ان غلاموں کا نہیں کہ جنہوں نے اپنی محنت و مشقت سے ترقی کو کمال تک پہنچایا آج جو یورپ و امریکہ کی خوشحالی، ترقی اور آزادی ہے اس میں افریقی غلاموں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس لئے آج افریقہ میں جب

قحط پڑتا ہے یا خشک سالی ہوتی ہے تو اس کی ذمہ داری یورپی اقوام پر ہے کہ جنہوں نے اس کو لوٹا، اس کے ذرائع کو تباہ کیا، اور اس کی آبادی کو گھٹایا، اس لئے اگر وہ اس کی مدد کرتے ہیں تو یہ مدد نہیں بلکہ وہ قرض ہے کہ جو یہ افریقہ سے لے چکے ہیں اور جسے واپس کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔

افریقی غلام اور تاریخ کا نقطہ نظر

غلامی کے مسئلہ کو ایک عرصہ تک مورخوں نے اس لئے نظر انداز کیا کہ اس سے مغربی معاشرے کے معاشی و سیاسی مفادات وابستہ تھے اور یہ ان کے امپیریل ازم کا ایک حصہ تھا۔ اس لئے انہوں نے نہ تو اس مسئلہ کو انسانی قدروں کے معیار پر جانچ کر دیکھا اور نہ ہی یہ دیکھا کہ اس عمل سے وہ افریقہ کو کیا نقصان پہنچا رہے ہیں، اور خود کیا فوائد حاصل کر رہے ہیں؟

دوسری جانب خود اہل افریقہ اس قابل نہیں تھے کہ اس مسئلہ پر لکھ سکیں اور ان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کی بھرپور نشان دہی کر سکیں۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کی ابتدا اس وقت ہوئی جب کہ یورپ میں غلامی کے خلاف تحریک چلی اور 1780ء اور 1790ء کی دہائیوں میں برطانوی پارلیمنٹ نے غلامی پر مواد اکٹھا کرنا شروع کر دیا تاکہ غلاموں کی تجارت کو روکا جا سکے۔ اس موضوع پر مزید مواد ان فرموں، کمپنیوں سے ملا کہ جنہوں نے اس تجارت میں حصہ لیا تھا اور انہوں نے غلاموں کی تعداد، ان کو افریقہ سے لانے پر اخراجات اور ان کی فروخت کے اعداد و شمار محفوظ رکھے تھے۔

غلامی کے بارے میں جو مغرب میں رویے تھے ان میں اس وقت تبدیلی آئی کہ جب پہلی جنگ عظیم نے ان کی نو آبادیات پر گرفت کمزور کر دی اور سیاسی شعور کی ایک لہر پوری دنیا میں پھیل گئی۔ ساتھ ہی امپیریل ازم کہ جس کی جڑیں بڑی گہری تھیں

اس میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ لہٰذا اب جب غلامی کے مسئلہ کا جائزہ لیا گیا تو یہ احساس ہوا کہ یہ تو ایک بڑا انسانی جرم تھا کہ جو مغربی تہذیب کے ہاتھوں ہوا۔ چنانچہ اس احساس جرم کے ساتھ اس مسئلہ کا تجزیہ کیا گیا اور اس پورے عمل کی تشکیل نئے سرے سے کی گئی کہ کس طرح سے غلاموں کو پکڑا جاتا تھا، انہیں جہازوں میں تعداد سے زیادہ بھرا جاتا تھا اور پھر کس طرح سفر میں یہ بیماریوں اور وباؤں کا شکار ہو کر مرتے تھے۔ اور جو اس اذیت سے گزر جاتے تھے وہ غلام بن کر اپنی بقایا زندگی کس کرب سے گزارتے تھے۔

غلامی کے نقطہ نظر میں اس وقت مزید تبدیلی آئی جب انہیں کی آنے والی نسل نے اس موضوع پر لکھنا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں ولیمز ارک کی کتاب "سرمایہ داری اور غلامی" (1944ء) انتہائی اہم تھی کہ جس نے ایک نئی بحث کا آغاز کیا۔ ولیمز نے اس نظریہ کو پیش کیا کہ مغرب کی صنعتی ترقی اور سرمایہ داری کی پیدائش دار تقاء میں غلاموں نے حصہ لیا اور جب یہ نظام ترقی پر تھا تو اس وقت اس نے غلامی کو ختم کرنے کی تحریک چلائی۔

اس کے بعد سے غلامی کو کئی انداز سے دیکھا گیا اور اس کا تجزیہ کیا گیا۔ مثلاً صرف اخلاقی نقطہ نظر سے اس کو برا نہیں کہا گیا بلکہ اس کے معاشی اثرات پر خصوصیت سے روشنی ڈالی گئی اور یہ سوال اٹھایا گیا کہ افریقہ سے غلاموں کی تجارت سے کس کو فائدہ ہوا؟ اس پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ افریقہ سے جن غلاموں کو خرید کر لایا جاتا تھا ان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ مفت میں پکڑ کر لاتے جاتے تھے یا بہت سستے داموں ان کا سودا ہوتا تھا۔ جب کہ ایسا نہیں تھا کیونکہ اول تو افریقی تاجر اس تجارت میں اہم کردار ادا کرتے تھے اور غلاموں کی قیمتیں مارکیٹ کی ضرورت کے تحت مقرر کرتے تھے اور اس طرح ان غلاموں کے بدلے میں وہ زراعتی آلات، ہتھیار، بارود، شراب، تمباکو اور نقد رقم وصول کیا کرتے تھے۔ اس طرح سے ان غلاموں کی قیمت افریقہ میں

رہتی تھی اور یہ وہاں کے حکمراں طبقوں کے استعمال میں آتی تھی جو اسے اپنی عیاشی پر خرچ کرتے تھے۔ کچھ مورخوں نے اس کا بھی جواب دیا ہے کہ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ غلام سفر کے دوران اس لئے مرجاتے تھے کہ ان کو بری طرح سے کم جگہ پر ٹھونسا جاتا تھا جب کہ اس کے شواہد دئے جاتے ہیں کہ اکثر غلام چیچک، خسرہ اور دوسری بیماریوں کی وجہ سے مرتے تھے۔

اگر دیکھا جائے تو اس تحقیق کے ذریعہ غلامی کے مسئلہ کے انسانی پہلو سے توجہ ہٹانا تھی۔ یہ سوال کہ غلاموں کی تجارت سے کس کو فائدہ ہوا؟ یورپی اقوام کو یا افریقی تاجروں کو! یہ دو پارٹیوں کے درمیان معاشی فوائد کا سوال تھا مگر اس بحث میں غلام کہاں گئے؟ اگر افریقی تاجروں کو بھی فائدہ ہوا تو اس سے غلاموں کی اذیت اور ان کے ساتھ کئے جانے والے جرائم تو کم نہیں ہوں گے۔

کچھ مورخوں نے غلامی کے ادارے اور اس کے پھیلاؤ پر تحقیق کرتے ہوئے اس کی نشان دہی کی کہ جیسے جیسے یورپ اور دنیا کی منڈیوں میں تمباکو، روئی، کافی اور شکر کی ضرورت بڑھی اور ان کی مانگ زیادہ ہوئی تو زیادہ پیداوار کے لئے زیادہ غلاموں کی ضرورت ہوئی اس طرح غلاموں کی تجارت برابر بڑھتی رہی۔

اس کے علاوہ دوسرے اور موضوعات جن پر کام ہوا وہ غلاموں کی آبادی، ان کی صحت، غذا اور اموات وغیرہ ہیں۔ ان مختلف موضوعات کے نتیجہ میں غلامی کی تاریخ کے بہت سے پوشیدہ پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔

امریکہ میں اس موضوع پر اس نقطہ نظر سے بھی کام ہوا ہے کہ صرف شمالی امریکہ میں غلامی کی وجہ سے کیا اثرات ہوئے؟ اور خصوصیت سے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ غلامی سے کس کو فائدہ ہوا؟ اور آیا اس نے امریکہ کو معاشی فوائد بھی پہنچائے یا نہیں؟ اکثر مورخوں نے تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ امریکہ میں اول تو ان غلاموں کے

ساتھ برا سلوک ہوا اور اس انسانیت سوز سلوک کی وجہ سے غلاموں کی نفسیات بدل گئی جس کی مثال دیتے ہوتے انہوں نے جرمنی میں نازی دور میں کیمپوں کی زندگی، اور غلاموں کی زندگی کا مقابلہ کیا ہے۔

مورخوں نے خصوصیت سے اس پہلو کی بھی نشان دہی کی ہے کہ افریقی غلاموں کی موجودگی کی وجہ سے امریکہ میں نسل پرستی کو فروغ ہوا اور معاشرہ میں نسلی تعصبات و نفرت کے نظریات نے جڑیں پکڑلیں۔ غلام عورتوں سے ان کے سفید آقاؤں نے جو جنسی تعلقات قائم کئے ان کی بنیاد نہ تو کسی قانون پر تھی اور نہ ہی اخلاق پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بغیر شادی کے بچے پیدا کرنا اور اس سے کسی قسم کا معاہدہ نہ کرنا اس نے معاشرہ میں ایک طرف تو عورت کو پس ماندہ کیا دوسری طرف سماجی رشتوں کو کمزور کیا۔

امریکہ میں جنوب کے علاقہ والوں کو غلامی سے انتہائی فائدہ ہوا، مگر معاشی فائدہ کے ساتھ ساتھ اس علاقہ کے لوگوں کی ذھنیت انتہائی رجعت و قدامت پرست ہو گئی انہیں غلاموں کی وجہ سے جو معاشی، سیاسی اور سماجی فائدے ہوتے ان کی وجہ سے وہ نظام میں کسی قسم کی تبدیلی کے لئے تیار نہیں تھے اور اسے اسی طرح برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

غلاموں پر جو ادب لکھا گیا اس میں الکس ہیلی کی کتاب روٹس (جڑیں) بڑی اہم ہے۔ اس کتاب اور اس کی بنیاد پر بننے والی فلم نے غلامی کے دور کی اس خوبصورتی سے عکاسی کی اور ان جرائم اور ناانصافیوں کو اس خوبصورتی سے اجاگر کیا کہ اس سے ہر پڑھنے اور دیکھنے والا متاثر ہوتا ہے۔

غلاموں کی زندگی

افریقہ سے بڑی تعداد میں غلاموں کو لانے کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ کی زمین جواب تک استعمال نہیں ہوئی تھی اور جس کی زرخیزی میں دولت چھپی ہوئی تھی اسے ایسی فصلوں کی پیداوار کے لئے استعمال کیا جائے کہ جس کی دنیا میں ضرورت ہے۔ لہٰذا ان غلاموں سے ضرورت سے زیادہ کام لیا جائے۔ مگر غلاموں سے اتنا کام لینے کے لئے انہیں کس طرح سے آمادہ کیا جائے؟ چونکہ غلام ان کی ملکیت تھے اور آزاد مزدور نہیں تھے اس لئے انہیں تنخواہ دینے کا تو سوال پیدا نہیں ہوتا تھا اور جب غلاموں کو ان کی مزدوری کا صلہ ملنے کی امید نہ ہو تو ان میں کام سے دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے ان سے کام لینے کے لئے ایک ہی طریقہ تھا کہ ان میں سزا کا خوف پیدا کیا جائے۔ یہ احساس دلایا جائے کہ ان کی ہر وقت اور ہر لحہ نگرانی ہو رہی ہے تاکہ وہ کام میں کوتاہی نہ کریں۔

غلاموں کے ہر جرم کی سزائیں مقرر تھیں اور یہ سزائیں پابندی سے دی جاتی تھیں تاکہ ان کے اندر مزاحمت کے جو بھی جذبات ہوں ان کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک مورخ نے سزاؤں کا جواز پیش کرتے ہوئے اس کا اس طرح سے تجزیہ کیا ہے کہ سزا اس لئے دی جاتی تھی تاکہ جرم کرنے والا دوبارہ سے اس غلطی یا جرم کو نہیں دہرائے۔ دوسرا اس کا یہ بھی مقصد تھا کہ دیکھنے والوں کو عبرت ہو تاکہ انہیں سزا دیتے
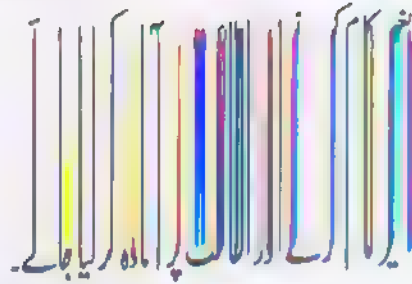
جب یہ غلام کھیتوں میں کام کرتے تھے تو اس وقت ان کی نگرانی کی جاتی تھی اور ان کے نگران گھوڑوں پر سوار یا پیدل خاموشی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے اور کام کو دیکھتے رہتے تھے۔ اس دوران میں غلام خاموشی سے آنکھیں جھکائے کام میں مصروف رہتے تھے۔

سزا کے اس خوف کی وجہ سے غلاموں کی نفسیات میں اپنے کمزور ہونے اور غیر محفوظ ہونے کا احساس پیدا ہو گیا اور ہر وقت کی نگرانی کے تاثر نے ان کی آزادی کے جذبہ کو ختم کرنے میں مدد دی جو مالکوں کے لئے ضروری تھا۔ اس کے علاوہ اس بات کی بھی کوشش کی جاتی تھی کہ غلام اکٹھے نہ ہوں اور نگراں کی نظروں سے دور ایک دوسرے سے مل جل کر نہ رہیں۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ ان میں کیمونٹی کا احساس پیدا نہ ہو جو کہ ان میں اعتماد پیدا کرتا اور انہیں قوت و طاقت کا احساس دلاتا۔

غلاموں پر مزید اختیارات حاصل کرنے کے لئے اس قسم کے قوانین بنائے گئے کہ جن نے مالک کو ان پر مکمل کنٹرول دے دیا۔ لہٰذا فرار کی صورت میں یا بغاوت کے نتیجہ میں مالک کو اختیار تھا کہ ان پر تشدد کرے اور انہیں قتل کرے۔ ان سختیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنے والی نسلوں میں غلامی کے خلاف مزاحمت اس لئے نہیں رہی کہ وہ شروع سے اس زندگی کے عادی ہو جاتے تھے۔ لیکن غلاموں پر ان تمام سختیوں اور سزاؤں کے خوف کے باوجود ان کے آقاؤں میں یہ ڈر اور خوف رہتا تھا کہ کہیں ان کے غلام بغاوت نہ کر دیں اس لئے کھنچاؤ کی فضا دونوں طرف رہتی تھی اور ان کے باہمی تعلقات میں شک و شبہ رہتا تھا۔

غلاموں کا کوئی خاندان نہیں بن پاتا تھا۔ کیونکہ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ شادی کریں۔ بچے ہوں اور ان کا کوئی گھر ہو۔ یہ سب غلامی میں ممکن نہیں تھا۔ ایک غلام کسی غلام عورت سے شادی کر لیتا تھا مگر اس شادی کی اول تو کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی

تھی، صرف یہ ہوتا تھا کہ اگر کھیت پر (PLANTATION) کسی کو کوئی عورت مل جاتی تھی تو دونوں باہمی رضامندی سے ایک ساتھ رہنا شروع کر دیتے تھے۔ اس کے لئے نہ تو رسومات کی ضرورت تھی اور نہ ہی کسی اعلان کی۔ اس قسم کی شادی کے نتیجہ میں بچے بھی پیدا ہوتے تھے مگر یہ خاندان کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا تھا۔ اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مالک عورت، مرد یا بچوں کو فروخت کر دیتا تھا اور خاندان جب جدا ہو جاتا تھا تو پھر کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل پاتا تھا۔اس صورت میں عورت دوبارہ سے اپنا ساتھی تلاش کر لیتی تھی اور یہی صورت مرد کے ساتھ پیش آتی تھی۔ دوسری صورت خاندانوں کے بگڑنے کی یہ ہوتی تھی کہ اگر مالک کا دیوالیہ ہو جائے یا اس کی جائداد تقسیم ہو جائے تو اس کے ساتھ ہی غلام بھی بکھر جاتے تھے۔ اس لئے غلاموں میں کسی خاندان کا بنانا اور ان سے جذباتی لگاؤ برقرار رکھنا مشکل تھا۔ اس کا اثر بھی غلاموں کی نفسیات پر پڑا اور اس سے ان کی شخصیت ٹوٹ کر رہ گئی۔

غلاموں کی رہائش کھیتوں پر ہوتی تھی جہاں ان کے رہنے کے لئے یا تو بیرکیں بنائی جاتی تھیں یا چھوٹے چھوٹے کیبن جہاں یہ ایک دوسرے سے انتہائی قریب رہتے تھے۔ یہ کیبن نہ صرف یہ کہ چھوٹے ہوتے تھے بلکہ ان میں بند کھڑکیاں اور کچا فرش ہوتا تھا۔ اس لئے کھانا پکانے کی وجہ سے چھتوں اور دیواروں پر دھواں جم جاتا تھا۔ تازہ ہوا نہ ہونے کی وجہ سے ان میں انتہائی گھٹن ہوتی تھی۔ پختہ فرش نہ ہونے کی وجہ سے سلین رہتی تھی۔ جہاں تک ان کے کھانے کا تعلق ہے تو یہ اگرچہ مقدار میں کافی ہوتا تھا لیکن بدذائقہ۔ غلاموں کو اس کا کوئی اختیار نہیں تھا کہ وہ اپنی پسند کے کھانے کے بارے میں سوچیں یا فیصلہ کریں۔

ایک مورخ نے غلاموں کی اس زندگی کے بارے میں بھی چند مثبت پہلو ڈھونڈ نکالے۔ اس کے مطابق انسان کی زندگی میں بنیادی مسائل غذا، مکان اور تحفظ کا ہوتا ہے اور غلاموں کو ان میں سے کسی کی فکر نہیں کرنی پڑتی تھی بلکہ یہ مالک کی ذمہ داری

تھی کہ وہ ان کے لئے غذا کا انتظام کرے، انہیں رہائش مہیا کرے اور ان کی حفاظت بھی کرے۔ اس طرح سے غلام ان تمام فکروں سے آزاد تھے کہ جو ایک آزاد شخص کو ہوتی ہیں۔

اس نظام نے جس قسم کے غلاموں کو پیدا کیا اس میں ان کی شخصیت بٹی ہوتی تھی۔ وہ ایک طرف اطاعت گزار تھے تو دوسری طرف لاپرواہ، ایک طرف خدمت گزار تو دوسری طرف سست، ایک طرف خاکساری دکھاتے تھے تو دوسری طرف دھوکہ دینے سے بھی باز نہیں آتے تھے۔

جب ان غلاموں کو افریقہ سے لایا گیا تھا تو ان کے مذہبی عقائد اور اعتقادات مختلف تھے لیکن کھیتوں میں رہنے اور کام کرنے کے دوران انہیں عیسائی بنایا گیا۔ ابتدائی نسلوں میں دونوں مذاہب یکجا رہے مگر آہستہ آہستہ یہ پکے عیسائی ہو گئے انہیں عیسائی بنانے میں ان کے مالکوں کی دلچسپی یہ تھی کہ اس طرح سے ان میں وفاداری، خدمت اور اطاعت گزاری کے جذبات کو مذہب کے ذریعہ مضبوط کیا جائے۔ اگرچہ آقا اور غلام ایک مذہب کے ہو گئے مگر اس کے باوجود انہیں کسی قسم کی مراعات نہیں دی گئیں ایک لحاظ سے عیسائیت نے ان غلاموں میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ مزاحمت بیکار ہے اور ظلم کا بدلہ ان کے آقاؤں کو آخرت میں ملے گا اور وہ جو بھی مظالم برداشت کر رہے ہیں اس کی جزا انہیں ضرور ملے گی۔ عیسائیت نے جس طرح سے رومی امپائر میں عیسائیوں کو ظلم برداشت کرنے کی تلقین کی تھی وہی عمل امریکہ میں غلاموں پر دہرایا گیا اور وہ اس امید میں تمام ناانصافیوں کو برداشت کرتے رہے کہ کوئی آئے گا اور انہیں نجات دلائے گا۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ مذہب کی وجہ سے ان میں اتحاد ضرور پیدا ہوا اتحاد کی دوسری کڑی زبان تھی۔ ان کی افریقی زبانیں ختم ہوتی چلی گئیں اور انگریزی ان کی زبان بن گئی لیکن مذہب اور زبان دونوں انہیں سفید معاشرہ میں کوئی سماجی رتبہ نہیں دے سکے۔

غلام معاشرہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ان حالات میں جب کہ وہ جبر اور تشدد کے تلے دبے ہوئے تھے خوف و عدم تحفظ ان کے ذہنوں پر سوار تھا۔ ان کی کوئی خاندانی زندگی نہیں تھی۔ کوئی دوستی اور رشتہ داری کے سہارے نہیں تھے۔ ذلت و خواری اور احساس کمتری ان کا مقدر تھی۔ ان حالات میں بھی انہوں نے ایک ایسے کلچر کو پیدا کیا کہ جو تھا تو غلامی کا کلچر مگر اس میں اتنی توانائی اور حرارت تھی کہ جو آزاد فضاؤں میں پروان چڑھنے والے کلچر سے مقابلہ کر سکتا تھا۔ ان کے اس کلچر کی بنیاد تو ان کا افریقی ماضی تھا کہ جس میں ان کی اجتماعی یادداشتیں پیوست تھیں مگر امریکہ کے نئے ماحول میں انہوں نے دونوں تجربات کو ہم آہنگ کر دیا۔ اس غلامی کے کلچر نے ان میں اپنی علیحدہ شناخت کو ابھارا۔ ان میں ہم آہنگی کے جذبات کو پیدا کیا اور ان میں اس جرات کو پیدا کیا کہ وہ اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کریں۔

ان کے کلچر کا اظہار سب سے زیادہ گیتوں، کہانیوں اور رقص و موسیقی میں ہوا۔ اس کے ذریعہ سے انہوں نے اپنے چھپے ہوئے جذبات کا اظہار کیا کہ جو غم و مایوسی کے نیچے دبے ہوئے تھے اور جن کے اظہار کے لئے اور دوسرے راستے نہیں تھے۔ ان کی موسیقی بھی انفرادی اور اجتماعی جذبات کا اظہار تھی۔ غلاموں کی کہانیوں میں ان کی زندگی پوری طرح سے جھلکتی ہے۔ ان میں امید بھی ہے اور خوف بھی۔ ان کہانیوں میں وہ بھی ہیں کہ جن میں یہ سبق ہے کہ مالک کے ساتھ وفادار رہا جائے اور زندگی میں انکساری اور اطاعت گزاری کو اختیار کیا جائے۔ لیکن ایسی کہانیاں بھی ہیں کہ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کمزور کو کس طرح دھوکہ اور فریب کے ذریعہ طاقت ور سے فائدے حاصل کرنا چاہئیں۔ ان کہانیوں کا مقصد یہ تھا کہ غلاموں کو جن کے لئے حق اور انصاف کے ذریعہ مراعات حاصل کرنا ناممکن تھا انہیں چاہئے کہ حیلہ اور مکر کے ذریعہ فوائد حاصل کریں۔

غلاموں نے جو کلچر پیدا کیا اس نے ان کی زندگی کے اس خلا کو بھر دیا کہ جو خالی تھا۔ ایک ایسے ماحول میں کہ جس میں غلاموں کی اپنی کوئی چیز بھی نہیں تھی اس میں گیت،

موسیقی اور رقص کے گانے اور کہانیاں ایسی چیزیں تھیں جو ان کی ملکیت تھیں اور جسے ان کے آقا ان سے نہیں چھین سکتے تھے اور پھر ان کے ذریعہ انہوں نے اپنے جذبات کا ایسے مؤثر انداز میں اظہار کیا کہ ایک طرف تو سننے والا ان سے متاثر ہوتا ہے۔ دوسرے خود انہیں زندہ رہنے کا حوصلہ ہوا۔

امریکہ کی سفید آبادی پر غلامی کے کیا اثرات ہوتے۔ اس کا اندازہ تو فرینکلن نے کیا ہے جس نے 1751ء میں ایک پمفلٹ میں لکھا تھا کہ نیگروز جنہیں شکر پیدا کرنے والے جزیروں میں لایا گیا ہے ان کی وجہ سے وہاں پر سفید فام افراد کی تعداد گھٹ گئی ہے اور چند خاندانوں نے اپنی اجارہ داری قائم کر لی ہے جو کہ بیرونی عیاشی کے لوازمات سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ان کی اولاد عیاشی و آرام کی دلدادہ ہو گئی ہے اور اس آمدنی سے کہ جو سو افراد کے لئے کافی ہو صرف ایک فرد فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ سفید خاندان کہ جن کے پاس غلام ہیں وہ محنت نہ کرنے کی وجہ سے سست و کاہل اور ناکارہ ہو گئے ہیں اور غلام کہ جو سخت محنت مزدوری کرتے ہیں انہیں پوری طرح سے کھانے کو نہیں دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ بیمار ہو جاتے ہیں اس طرح ان میں پیدا ہونے والوں سے زیادہ مرنے والوں کی تعداد ہوتی ہے اور اس لئے تازہ غلاموں کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ وہ خاندان جہاں غلام ہیں ان کے بچے مغرور ہو جاتے ہیں اور محنت سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح ان میں کاہلی جڑ پکڑ لیتی ہے اور وہ کسی بھی تکلیف کو برداشت کرنے کے قابل نہیں رہتے ہیں۔

اس کی ایک مثال سرینام میں غلاموں کی تھی کہ جہاں 1680ء کی دہائی میں 7 سو کے قریب یورپی آباد تھے جب کہ غلاموں کی تعداد 45 سو تھی۔ یہ سفید فام افراد کم وقت میں زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی خاطر ان غلاموں سے انتہائی مشقت سے کام کراتے تھے اور انہیں جو منافع ہوتا تھا وہ اس قدر زیادہ تھا کہ یہ اپنی عیاشی اور سہولت اور آسائش کے لئے سامان اور لوازمات یورپ سے منگوایا کرتے تھے۔ ان لوگوں کی

خدمت کے لئے غلاموں کی ایک بڑی تعداد ہوتی تھی۔ انہیں کھانا کھلانے کے لئے تقریباً برہنہ غلاموں کی ایک فوج ان کے ہر اشارے کی تعمیل کرنے کے لئے کھڑی ہوتی تھی۔ ان کے گھروں کے باہر دروازے پر غلاموں کو بطور سزا لٹکایا ہوا ہوتا تھا جہاں معمولی جرائم پر انہیں کوڑے مارے جاتے تھے اور سزا دی جاتی تھی۔ سرنیام کی یہ کالونی ایک طرف تو اپنی دولت اور خوش حالی کے لئے مشہور تھی تو دوسری طرف اپنے مظالم اور غلاموں کی پس ماندگی کے لئے۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ غلامی کی وجہ سے رنگ کی بنیاد پر نسل پرستی کی ابتدا ہوتی جو غلامی کے خاتمہ کے بعد بھی اب تک باقی ہے۔

غلام، بغاوتیں اور ہیرون

غلاموں کی زندگی کے بارے میں ہم نے پڑھا کہ انہیں کس طرح سخت نگرانی اور خوف کی حالت میں رکھا جاتا تھا اور انہیں کس طرح دن رات کام میں مصروف رکھ کر جسمانی طور پر تھکا دیا جاتا تھا۔ اس تمام عمل میں کوشش یہ ہوتی تھی کہ غلام میں مزاحمت کے تمام جذبات ختم کر دئے جائیں ورا سے محض کام کرنے کی مشین میں تبدیل کر دیا جائے۔ مگر ان تمام کوششوں کے باوجود انسانوں میں آزادی کے جو جذبات ہیں اور ناانصافیوں کے خلاف جو مزاحمت کے جراثیم پوشیدہ ہیں وہ غلاموں میں بغاوتوں کی صورت میں برابر ابھرتے رہے اور غلام اپنے خلاف ہونے والے مظالم کو برابر چیلنج کرتے رہے۔

اگرچہ تاریخ میں غلاموں کی لاتعداد بغاوتیں ہیں مگر ان بغاوتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی اور اس لئے ان کا تذکرہ بھی نہیں کیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان میں سے اکثر بغاوتیں معمولی نوعیت کی تھیں اور انہیں آسانی سے کچل دیا گیا اس لئے مورخوں نے ان کے سماجی، سیاسی اور معاشی نتائج کے تجزیہ کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے مقابلہ میں صرف ان بغاوتوں کا ذکر کیا کہ جن میں ایک لاکھ کے قریب غلاموں نے شرکت کی اور جن کی وجہ سے سلطنتیں ہل کر رہ گئیں۔ ان میں سے دو رومیوں کے عہد میں 2 صدی قبل مسیح میں واقع ہوئیں جن میں سے ایک اسپارٹاکس کی

مشہور بغاوت ہے تیسری بڑی بغاوت 1790ء کی دہائی میں فرانسیسی کالونی ڈومینگ میں واقع ہوئی۔

ان بغاوتوں کا تذکرہ نہ کرنے یا معمولی سا ذکر کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ہم عصر مورخ نہیں چاہتے تھے کہ اس کی وجہ سے لوگوں میں خوف و ہراس پھیلے۔ بعد میں آنے والے مورخ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ غلامی کا ادارہ کوئی خراب نہیں تھا اور یہ ایک فطری چیز تھی۔ اس لئے غلاموں کی بغاوت تاریخ میں اہمیت نہیں رکھتی ہے۔ اب موجودہ دور میں مورخ غلاموں کی بغاوت کو خاص اہمیت دے رہے ہیں اور ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ بغاوتیں کیوں ہوئیں؟ ان کے کیا نتائج تھے؟ اور اگر بغاوتیں کم ہوئیں تو اس کی کیا وجوہات تھیں۔

مثلاً غلاموں کے لئے بغاوت اپنے خلاف ہونے والے مظالم اور ناانصافیوں کے جواب میں آخری حربہ ہوتا تھا۔ کیونکہ غلام جس ماحول میں رہتا تھا وہاں اس کی شخصیت کو مکمل طور پر کچل کر اسے انسانی درجہ سے گرا دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس میں غلامی کی ذہنیت پیدا ہو جاتی تھی اور اسے خاموش، اطاعت کرنے والا اور ظلم کو برداشت کرنے والا انسان بنا دیا جاتا تھا کہ جس میں کسی قسم کا شعور نہیں تھا کہ جو اپنی حالت کا تجزیہ کر سکتا اور خود کو غلامی سے آزاد کرانے کے بارے میں سوچ سکتا۔

لیکن ان حالات میں بھی اسے ایسے مواقع میسر آئے کہ جن میں اس نے اس شعور کو پیدا کیا کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ اس کے بعد ہی اس میں مزاحمت کے جذبات پیدا ہوئے اور یہ جذبات بغاوت کی طرف لے کر گئے۔ غلاموں کے ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے ان میں اتحاد کا احساس پیدا ہوا اور جب ان کے کسی ساتھی کے ساتھ زیادتی ہوتی اور اسے سزا ملتی تو انہیں اس سے ہمدردی ہوتی اور جہاں تک ممکن تھا یہ اس کی مدد کرتے۔ کچھ علاقوں میں کام کی غرض سے غلاموں کو بڑی تعداد میں لایا گیا۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد سفید فاموں سے بڑھ گئی۔ جب انہیں اس کا احساس ہوا تو اس نے

ان میں طاقت اور اعتماد کو پیدا کیا۔ ان کے تجربات اس وقت اور بڑھے جب کہ ان کے سفید فام آقاؤں نے انہیں باہمی جنگوں اور لڑائیوں میں استعمال کیا اس کی وجہ سے انہیں جنگ کے بارے میں معلومات ہوئیں۔ دوسرے سفید فام لوگوں کی کمزوریوں کے بارے میں پتہ چلا۔

انہیں بغاوت کرنے یا فرار کے لئے اکسانے والے حالات اس وقت ہمت افزا ہوتے جب انہوں نے اپنے اردگرد گھنے جنگلات یا اونچے اور دشوار گزار پہاڑوں کو دیکھا کہ جہاں وہ پناہ لے سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس نظام کی کمزوریوں پر غور کرنا شروع کیا کہ جو ان پر کنٹرول کئے ہوتے تھا۔ اگر انہیں کوئی راہنمال جاتا تھا تو پھر یہ اس کی صلاحیتوں پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ تعاون کرتے تھے بغاوت کے پس منظر میں اہم چیز یہ تھی کہ انہیں یہ امید ہوتی تھی کہ انہیں کامیابی ہوگی اور وہ استحصال سے فرار حاصل کر کے آزادی کی زندگی گزار سکیں گے۔

غلاموں کی بغاوتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے کئی باتیں سامنے آتی ہیں مثلاً اول تو یہ بات کہ غلام جب بھی بغاوت کرتے تھے تو یہ بغاوت ایک کمزور جماعت کی طاقت ور جماعت کے خلاف ہوتی تھی اور اس بغاوت میں باغیوں کے پاس نہ تو مناسب ہتھیار ہوتے تھے اور نہ غذا کا بندوبست، اس لئے اپنے مقابل سے نمٹنے کے لئے انہیں ان سے زیادہ ذہانت، ہوش مندی اور سیاست کا ثبوت دینا پڑتا تھا۔ جو راہنما کے انتخاب سے لے کر بغاوت کے وقت، جگہ کا انتخاب اور مخالفوں سے مزاحمت تک کے مراحل میں تھا۔ اور غلاموں نے ان بغاوتوں میں جس جرات مندی، ہوشیاری، چالاکی اور سیاسی سوجھ بوجھ سے کام لیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان غلاموں نے برے وقتوں سے سیکھا تھا اور زمانہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی بجائے انہوں نے خاموشی سے لڑنے اور مزاحمت کرنے کے تجربات حاصل کئے تھے۔

سفید فام آقا کہ جن کے غلام ان کی ملکیت تھے اور جو ان کے ذریعہ زیادہ سے

زیادہ منافع کمانا چاہتے تھے وہ کسی بھی صورت میں نہیں چاہتے تھے کہ ان کے غلام فرار ہوں یا بغاوت کریں۔ اس لئے انہوں نے فرار ہونے کی سخت سزائیں مقرر کر رکھی تھیں۔ مثلاً اگر کوئی غلام کام سے بچنے کے لئے قریبی جنگل میں فرار ہو جاتا اور پکڑا جاتا تو اس کے اس پہلے جرم پر اس کی ایڑھی کاٹ دی جاتی تھی اور اگر وہ دوبارہ فرار ہوتا تو اس صورت میں اس کا سیدھا پاؤں کاٹ ڈالا جاتا تھا تاکہ وہ بھاگ ہی نہیں سکے۔

لیکن تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزائیں بھی غلاموں کو مزاحمت سے یا بھاگنے سے نہیں روک سکیں۔ یہ مزاحمتیں دو قسم کی ہوتی تھیں جن کو ہم خاموش اور نظر آنے والی مزاحمتیں کہہ سکتے ہیں۔ خاموش مزاحمت میں غلام فرار نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنے غصہ کا اظہار اس طرح کرتے تھے کہ کام کرتے ہوئے اوزار، آلات اور سامان توڑ دیتے تھے کام کو بگاڑ دیتے تھے۔ اور اس قسم کے طریقے استعمال کرتے تھے کہ جس سے مالک کو نقصان بھی ہو اور وہ پکڑ میں بھی نہیں آ سکیں۔

دوسری صورت وہ ہوتی تھی کہ جب ان کی نفرت، غصہ اور اپنی ذلت کا احساس اس قدر بڑھ جاتا تھا کہ وہ اس کا حل فرار اور بغاوت میں ڈھونڈتے تھے۔ چنانچہ اس میں فرار ایسا طریقہ تھا کہ جس میں وہ مالک اور کام کو چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ اس سے مالک اپنے غلام سے محروم ہوتا تھا مگر اس سے زیادہ اسے نقصان نہیں ہوتا تھا، تیسری صورت بغاوت کی تھی۔ اس میں اچانک حملہ کر کے مالک اور اس کے ساتھیوں کا قتل، لوٹ مار اور آگ لگانا ہوتی تھی۔ یہ پر تشدد ہوتی تھی اور مالک کو خوفزدہ کر دیتی تھی۔

فرار اور بغاوت کے بعد غلاموں کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ انتقام سے بچنے کے لئے دور دراز اور مشکل مقامات پر اپنی آبادی قائم کر لیں۔ اس قسم کی آبادیاں میرون (MAROON) کہلاتی تھیں۔ یہ اس لئے ایسی جگہوں پر آباد کی جاتی تھیں کہ جہاں ان کے دشمن نہ پہنچ سکیں۔ مثلاً امریکہ کے جنوب میں دلدلی علاقوں کو اس مقصد کے لئے منتخب کیا جاتا تھا۔ جمیکا میں یہ میرونی ایسے پہاڑی علاقوں میں آباد تھے کہ جہاں زرخیز

زمین اور پانی کمیاب تھا۔ گیانا میں گھنے جنگل اس قسم کی بستیوں کے لئے موزوں ہوا کرتے تھے۔

یہ میرون سفید فام آقاؤں کے لئے چیلنج ہوا کرتے تھے کیونکہ یہ غلاموں کی کامیابی اور ان کی شکست کی زندہ علامتیں تھیں۔ اس لئے اپنی نفرت کا اظہار اس طرح سے کرتے تھے کہ انہیں قاتلوں، لٹیروں اور مجرموں کے ٹھکانے کہتے تھے اور مسلسل اس کوشش میں رہتے تھے کہ انہیں کسی طرح سے ختم کریں۔ چنانچہ میرونی کے رہنے والے حملوں کے اس مسلسل خطرے کی وجہ سے خود کو تیار رکھتے تھے اور ان سے بچاؤ کی خاطر مختلف طریقوں، حربوں اور ذریعوں کو استعمال کرتے تھے۔

مثلاً انہوں نے گوریلا طریقہ جنگ میں مہارت حاصل کر لی تھی اور حملہ کرو اور پسپا ہو جاؤ یا غائب ہو جاؤ کی پالیسی پر عمل کرتے تھے یا وہ اپنے علاقہ کے دشوار گزار راستوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حملہ آوروں کو اندر داخل ہونے دیتے تھے اور پھر اوپر سے ان پر پتھروں کی بارش کرتے یا درختوں کے موٹے موٹے تنے ان پر لڑھکاتے۔ اس طرح سے وہ کامیابی سے حملہ آوروں کو یا تو مکمل ختم کر دیتے تھے یا انہیں پسپائی پر مجبور کرتے تھے۔ ان کے یہ گوریلا حربے سفید فام حملہ آوروں کے لئے اس لئے مشکل کا باعث بنتے تھے کیونکہ وہ روایتی جنگ کے حربوں کو استعمال کرتے تھے جو ان کے مقابلہ میں کامیابی کا باعث نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے اپنے گوریلا طریقہ جنگ کی وجہ سے میرون کے لوگوں نے خود کو حملہ آوروں سے محفوظ رکھتے ہوئے اپنی آزادی کو برقرار رکھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم تعداد، ہتھیاروں کی کمی اور محدود وسائل کے باوجود غلاموں نے اپنی آزادی کا تحفظ کیا اور اپنی بستیوں کو قائم رکھتے ہوئے سفید فام برتری کو مسلسل چیلنج کیا۔

اس وجہ سے بہت سی صورتوں میں یہ ہوا کہ سفید فام لوگوں نے میرون کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے اپنے سیاسی و معاشی و سماجی تعلقات قائم کر لئے۔ چنانچہ برازیل،

کولمبیا، کیوبا، اکیواڈور، جمیکا اور سرینام میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ جب میرونوں کی آبادیوں کے ساتھ باقاعدہ معاہدے کئے گئے اور ان کی آزادی کو مانتے ہوئے ان کے پاس جو علاقے تھے ان پر ان کا قبضہ تسلیم کر لیا اور اس معاہدے کے بدلے میں کہ وہ سفید فام مالکوں کے کھیتوں کو تباہ و برباد نہیں کریں گے انہیں مراعات بھی دی گئیں۔ اگرچہ اس قسم کے معاہدوں کی خلاف ورزی بھی کی گئی اور میرونوں پر دھوکے سے حملے بھی کئے گئے مگر ان تمام باتوں کے باوجود غلام فرار ہوتے رہے، بغاوتیں کرتے رہے اور اپنی بستیاں بساتے رہے جو کہ سفید فام لوگوں کی تمام طاقت کے باوجود ختم نہیں ہو سکیں۔

میرون کی بستی اور اس کی رہائش کا دار و مدار حالات پر ہوا کرتا تھا۔ اکثر حملوں کا خوف زیادہ ہوتا تھا تو اس صورت میں مستقل بستی نہیں بسائی جاتی تھی اور نہ ہی کاشت کی جاتی تھی بلکہ اس صورت میں رہائش عارضی ہوتی تھی اور سامان مختصر تاکہ جیسے ہی حملہ ہو آسانی کے ساتھ فرار ہوا جا سکے اور محفوظ مقامات پر جایا جا سکے۔ کاشت کاری نہ ہونے کی صورت میں کھانے کا دار و مدار شکار، مچھلیاں پکڑنے اور پھلوں پر ہوا کرتا تھا۔

لیکن دوسری صورت میں کہ جہاں غلاموں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اور وہ اپنا دفاع کر سکتے تھے اس صورت میں باقاعدہ رہائش کے لئے جھونپڑیاں بنائی جاتی تھیں۔ قریبی زمینوں پر کاشت کی جاتی تھی اور حفاظت کے لئے انتظامات کئے جاتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ بھاگنے کے لئے بھی تیار رہتے تھے کیونکہ منظم حملہ آور فوجوں سے ان کا مقابلہ کرنا دشوار ہوا کرتا تھا اور جب بھی حملہ آور آتے تو وہ سب سے پہلے ان کے کھیتوں کو آگ لگا کر تباہ کرتے تھے تاکہ ان کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔

یہ بھاگے ہوئے اور باغی غلام جن علاقوں میں اپنی بستیاں بساتے تھے ان کی اپنی بقا اور زندگی کے لئے ضروری تھا کہ یہ اپنے علاقہ اور اس کے ماحول سے واقف ہوں۔ چنانچہ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ درختوں، جھاڑیوں اور فطرت کے دوسرے ذرائع

سے اپنی غذا اور رہائش کے لئے سامان حاصل کریں۔ شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سے انہوں نے خود کا فطرت سے رشتہ جوڑا اور ماحول میں خود کو ڈبولیا اس سے ان کی فطرت کا پتہ چلتا ہے کہ جس نے بدلتے حالات میں انہیں ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے اور نئے ماحول میں رہنے کا عادی بنا دیا۔ مثلاً سرنیام میں میرون کے رہنے والوں کے بارے میں ہے کہ انہوں نے جانوروں اور مچھلیوں کو پکڑنے کے لئے نئے نئے طریقے اختیار کئے تھے کہ جن کے ذریعہ وہ بغیر ہتھیار کے جانوروں کو پھنساتے تھے اور مچھلیوں کو پکڑتے تھے۔ نمک وہ پام درختوں کی راکھ سے بناتے تھے۔ تیل حاصل کرنے کا ایک ذریعہ پام درخت پر رہنے والے بڑے بڑے کیڑے ہوتے تھے جن کی چربی کو پگھلا کر وہ گھی یا تیل تیار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ پستوں یا دوسرے گری والے میوے سے بھی وہ گھی نکالتے تھے اور پام درخت کی شراب کی ان کے پاس کوئی کمی نہیں ہوتی تھی۔ صابن کے لئے وہ شاہ بلوط کے چھوٹے درختوں کو استعمال کرتے تھے۔

گھروں کی تعمیر میں وہ درختوں کے تنوں اور شاخوں کو استعمال کرتے تھے اور رات میں روشنی کے لئے وہ چربی سے جلنے والی شمعیں یا شہد کی مکھیوں کے چھتوں سے حاصل ہونے والی موم کو استعمال کرتے تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود بہت سے معاملات میں میرون کے رہنے والے باہم سے تعلقات رکھنے پر مجبور تھے۔ مثلاً کپڑوں کے معاملہ میں یا ہتھیاروں کی سپلائی میں۔ اس لئے یا تو وہ قریبی سفید فاموں کی آبادیوں سے تعلقات رکھتے تھے کہ جہاں ان کے لوگ مختلف اشیاء کے بدلے میں انہیں یہ سامان فراہم کر دیتے تھے یا وہ کھیتوں اور آبادیوں پر شب خون مارتے اور اپنی مرضی کی چیزیں لوٹ مار کر کے لاتے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ بہت سے غلام جو کھیتوں میں رہتے تھے یا شہروں میں مقیم تھے وہ خفیہ طریقے سے ان کی مدد کرتے تھے۔

اپنی بقا کے لئے میرون کے غلاموں نے ان لوگوں سے بھی رابطے اور تعلقات

رکھے کہ جو سفید فام لوگوں کے دشمن تھے، ان میں خصوصیت سے امریکہ کے قدیم باشندے شامل تھے، چنانچہ ان کے اور میرون کے رہنے والوں میں سماجی اور معاشی روابط بڑھ گئے اور یہ دشمنوں کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔

خاص طور سے میرون کے رہنے والوں کے لئے ایک مسئلہ یہ تھا کہ ان میں آبادی کی اکثریت مردوں کی تھی اور عورتوں کی کمی تھی، اس وجہ سے عورتوں کو حاصل کرنے کے لئے یہ سفید فام کھیتوں پر حملہ بھی کرتے تھے تاکہ وہاں سے عورتوں کو لایا جا سکے۔ اکثر انہوں نے ریڈ انڈین لوگوں کی عورتوں کو اغوا کیا اور ان سے روابط کے بعد ان کی عورتوں سے شادیاں بھی کیں۔ اس طرح ان میں اور انڈین لوگوں میں قریبی تعلقات قائم ہوئے۔

اس کے علاوہ انہوں نے ان بحری قزاقوں سے بھی قریبی روابط رکھے کہ جو سفید فام قوموں کے مخالف تھے مثلاً اس کے شواہد ملتے ہیں کہ انہوں نے ہسپانوی لوگوں کے خلاف انگریزی کیپٹن ڈریک کا ساتھ دیا۔ اس تعاون کے بدلے میں یہ یقیناً ان سے کچھ مراعات حاصل کرتے ہوں گے۔ انہوں نے یورپی اقوام کی باہمی رقابت سے بھی فائدہ اٹھایا اور ان میں ہونے والی جھڑپوں اور لڑائیوں میں کسی ایک کا ساتھ دے کر اپنے لئے تحفظ حاصل کیا۔ اس پورے عمل میں ان کی سیاسی بصیرت کا پتہ چلتا ہے کہ جس کے ذریعہ انہوں نے حالات کو سمجھا اور ان سے فائدہ اٹھایا۔

میرون میں خطرات کا مقابلہ کرنے اور معاشی و سماجی مسائل پر قابو پانے کے لئے ضروری تھا کہ وہاں پر نظم و ضبط اور قانون ہو۔ یہاں بھی غلاموں نے اپنے ماضی اور حال کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا۔ ابتداء میں انہوں نے اپنے رہنما کو بادشاہ بنا کر اس کے سپرد رہنمائی کے تمام اختیارات دیئے، بعد میں اپنے راہنما یا لیڈر کے لئے بادشاہ کے بجائے کیپٹن یا جنرل کے القاب استعمال کرنے لگے۔ کئی لحاظ سے میرون کی زندگی سخت ہوا کرتی تھی اور معمولی سی معمولی بات اور جرم پر سخت سزائیں دی جاتی تھیں تاکہ بستی کا

نظم برقرار رہے اور آپس میں جو جھگڑے اور اختلافات ہیں وہ آگے نہیں بڑھنے پائیں۔

اس لئے چوری، قتل اور زنا پر موت کی سزا تھی اور اگر کوئی بادشاہ یا کیپٹن کے حکم کے خلاف کوئی کام کرتا تھا تو اس کی بھی سخت سزا تھی۔ غداری اور مخبری کو روکنے کے لئے حفاظتی تدابیر تھیں۔ اس لئے جب نئے فرار شدہ غلام پناہ کی غرض سے آتے تھے تو ان پر اعتبار نہیں کیا جاتا تھا۔ اول تو انہیں لاتے وقت ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا جاتا تھا تاکہ وہ راستوں سے واقف نہ ہوں اس کے بعد انہیں ایک مقررہ مدت تک جو چند ماہ سے لے کر دو سال تک ہوتی تھی بستی سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی تاکہ اس عرصہ میں ان کی عادات و چال چلن کو دیکھا جا سکے۔ اگر کسی پر ذرا بھی مخبری یا جاسوسی کا شبہ ہو جاتا تھا تو اسے فوراً ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ کیونکہ دوسری صورت میں خود ان کے ختم ہونے کا ڈر ہوا کرتا تھا۔

میرون کی یہ زندگی صرف اپنے تحفظ اور بقا کے لئے ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ ان بستیوں میں ان غلاموں نے ایک نئی ثقافت بھی پیدا کی جس میں ان کے افریقی ماضی سے لے کر سفید فام لوگوں کے کھیتوں کے تجربے، میرون کی زندگی اور یہاں فطرت سے ان کے قریبی رشتے، یہ سب عناصر شامل تھے۔ یہ وہ ثقافت تھی کہ جس نے ان کی شناخت کی تشکیل میں مدد دی اور تاریخ میں ان کو علیحدہ مقام دیا۔ غلاموں کی یہ وہ میراث ہے جو انہوں نے دنیا کی تہذیب کو دی۔

غلامی کا خاتمہ

غلامی کے خاتمہ کی تحریک ابتداء میں برطانیہ میں شروع ہوئی اور اس کے بارے میں جو وجوہات تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں وہ یہ ہیں کہ اس کے پس منظر میں انسانی ہمدردی اور جذبہ کام کر رہا تھا۔ اہل برطانیہ اور یورپ کے لوگ غلاموں پر ہونے والے مظالم اور ناانصافیوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس ادارے کے خاتمہ کے لئے جدوجہد شروع کر دی اور اس کو مزید حمایت مذہبی جماعتوں کی طرف سے ملی جو اسے عیسائیت کے خلاف سمجھتے تھے اور اس کا خاتمہ چاہتے تھے۔

کچھ مورخ اس کی وجوہات میں یہ بھی شامل کر دیتے ہیں کہ جب غلاموں کی بغاوتوں میں اضافہ ہوا تو اندازہ ہوا کہ اس ادارے میں کچھ زیادہ ہی خرابیاں ہیں۔ پھر ان بغاوتوں کے خاتمہ کے لے جو فوجی اقدامات کئے گئے ان میں جانی اور مالی دونوں قسم کے نقصانات ہوئے۔ ہٰذا حساب کتاب کے بعد یہ اندازہ لگایا گیا کہ غلاموں سے جو فوائد ہو رہے تھے ان سے اب نقصانات زیادہ ہیں۔ س لئے اگر غلامی کو ختم کر دیا جائے تو یہ ان کے لئے مالی طور پر نقصان دہ نہیں ہو گا۔

پھر امریکہ نے آزادی کے بعد 1776ء میں اور فرانسیسی انقلاب کے دوران انسانی حقوق کے اعلان 1778ء میں تمام انسانوں کی برابری کا اعلان کیا تھا کہ جس کے بعد یورپ کے معاشروں میں جمہوری اقدار اور روایات کا فروغ ہوا تھا۔ اس لئے یہ سوالات

بھی اٹھے کہ غلام بھی انسان ہیں اور یہ ان کا پیدائشی حق ہے کہ وہ بحیثیت آزاد انسان کے معاشرے میں رہیں۔

یہ تمام وجوہات اپنی جگہ اور یقیناً انہوں نے غلامی کے خلاف لوگوں کے جذبات کو ابھارنے میں مدد بھی دی ہوگی مگر جب غلامی کے خاتمہ کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انسانی ہمدردی اور انسانی جذبات سے پہلے برطانیہ اور دوسری یورپی اقوام کے معاشی مفادات تھے۔ جب تک ان کے معاشی مفادات کو غلامی کے ذریعہ بہتر طریقے سے پورا کیا جاتا رہا اس ادارے کے خلاف کسی قسم کے جذبات پیدا نہیں ہوتے بلکہ برطانوی پارلیمنٹ، چرچ اور سیاسی جماعتوں اور راہنماؤں نے اس کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اس کے فوائد کو تسلیم کیا۔ جب بدلتے سیاسی حالات کی وجہ سے اور تجارت کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے نقصانات ہونے لگے تو غلامی کے خلاف نفرت اور غلاموں سے ہمدردی کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ اس لئے غلامی کے خاتمہ کی تحریک کے پس منظر میں معاشی مفادات کام کر رہے تھے اور انہیں مفادات کو پورا کرنے کی غرض سے مذہبی، انسانی اور جمہوری اقدار کو استعمال کیا گیا۔

انیسویں صدی میں برطانیہ نے غلامی کے خلاف جب تحریک شروع کی تو یورپی اقوام کے نقطہ نظر میں بڑا واضح فرق تھا۔ بل برطانیہ جن میں تاجر، سیاسی لیڈر اور حکومتی ادارے تھے وہ غلامی کو معاشی طور پر سود مند نہیں سمجھ رہے تھے مگر ان کے مقابلے میں دوسری اقوام کہ جن کی معاشی خوش حالی کا دارومدار غلاموں کی محنت پر تھا وہ اسے اپنے لئے فائدہ مند سمجھ رہے تھے اور اس لئے اسے برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ مثلاً اس زمانہ میں برازیل نے غلامی کے فائدوں کے بارے میں زبردست دلائل دیئے

ان کا کہنا تھا کہ جب سے افریقہ سے غلاموں کو لانے کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس کے بعد سے افریقی لوگوں کی زندگی بہتر ہو گئی ہے۔ برازیل کے وہ لوگ کہ جو غلاموں سے محنت مزدوری کراتے تھے وہ اس پر یقین رکھتے تھے اور ان کا یہ یقین صحیح بھی تھا

کہ ان کی خوش حالی اور برازیل کی خوش حالی افریقی غلاموں اور ان کی درآمد پر منحصر ہے۔ اس لئے اس کو ختم کرنے کا مطلب ہے کہ اپنے ہاتھوں خود کشی کی جائے۔

اس سلسلہ میں برازیل کے دانشوروں اور مورخوں نے بڑے دلچسپ دلائل دیئے اور برطانیہ کے غلامی کے خلاف رویہ پر سخت تنقید کی۔ مثلاً ایک دلیل یہ تھی کہ جب تک برطانیہ کا مفاد تھا وہ اپنے مجرموں کو جنہیں موت کی سزائیں دی گئیں تھیں انہیں موت کی سزا سے معافی دے کر بطور مزدور اپنی نوآبادیوں میں بھیج دیتے تھے اور اسے انسانی ہمدردی کا نام دیتے تھے، لہٰذا اب افریقہ سے کہ جو جہالت کا مرکز ہے اگر وہاں سے غلاموں کو لایا جاتا ہے تو یہ انسانیت کے خلاف ہو جاتا ہے۔ انگلستان کے رویہ میں اس تبدیلی کی وجہ انسانی ہمدردی نہیں بلکہ اس کے مفادات ہیں لہٰذا ان کا کہنا تھا کہ غلامی کے خاتمہ کی تحریک کا اصل مقصد یہ ہے کہ برازیل کی خوش حالی کو ختم کر کے اسے مفلسی و غربت میں دھکیل دیا جائے۔

پرتگال نے بھی برطانیہ کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا اور اسے الزام دیا کہ اس تحریک کے پیچھے اس کے سامراجی اور معاشی مفادات ہیں۔ وہ اپنی ہندوستانی شکر کی پیداوار کو بڑھانے اور اس کے لئے منڈیاں تلاش کرنے کی غرض سے ایسے ممالک کو جو شکر پیدا کرتے ہیں، ختم کرنا چاہتا ہے۔ اور مزید یہ کہ غلامی کے خاتمہ کے بعد برطانیہ سمندروں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، خصوصیت سے افریقی ساحلوں کو اپنے قابو میں لانے کا خواہش مند ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلامی کے خاتمہ کی تحریک کا تعلق خالصتاً معاشی مفادات سے تھا۔ اور اس لئے اس کی حمایت اور مخالفت انہیں بنیادوں پر کی جاتی تھی۔

خود برطانیہ کہ جس نے اس تحریک کو شروع کیا 63 برسوں کے دوران جو کہ 1787 سے 1850 تک ہیں اس تحریک میں اتار چڑھاؤ آتا رہا ہے اور اس اتار چڑھاؤ کے پس منظر میں اس کے تجارتی اور معاشی مفادات کام کر رہے تھے۔

ارک ولیمز نے کہ جس نے "سرمایہ داری اور غلامی" لکھ کر اس مسئلہ کو ایک نئے انداز سے دیکھا ہے وہ اس تحریک کے پس منظر کی وجوہات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

اٹھارویں صدی میں برطانوی تاجر طبقہ زور پکڑ رہا تھا اور انہیں نئی منڈیوں کی تلاش تھی۔ جزائر غرب الہند آہستہ آہستہ سیاسی اور معاشی اہمیت کھو رہے تھے؟ امریکہ کی 13 کالونیوں کے آزاد ہونے کے بعد برطانیہ اپنے مفادات کو امریکہ اور جزائر غرب الہند سے تبدیل کر کے ہندوستان کی جانب توجہ دے رہا تھا اور اس دوران شکر کی تجارت میں بہت زیادہ مقابلہ ہو گیا تھا۔ یہ وہ وجوہات تھیں کہ جنہوں نے اہل برطانیہ کے غلامی کے خاتمہ کے بارے میں رویوں کو جنم دیا۔

جیسا کہ تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے۔ برطانیہ کے رویہ میں سب سے پہلے اس وقت تبدیلی آئی جب اس کی امریکی مقبوضات آزاد ہو گئیں۔ بقول ایک مورخ کہ غلامی کے خاتمہ کی تحریک اگر امریکہ آزاد نہیں ہوا ہوتا تو اور پیچھے چلی جاتی اور اس میں مزید اور وقت درکار ہوتا۔

برطانیہ میں جو تاجر طبقہ ابھر رہا تھا اس کی نظر میں اب ایشیا و افریقہ کی منڈیاں اور ان کے ذرائع تھے۔ ان میں خصوصیت سے افریقہ اس لحاظ سے قابل ذکر تھا کہ اس کے ذرائع محفوظ تھے اور ان کو استعمال کرنے کے لئے انہیں بڑے مواقع تھے۔ اس لئے خیال یہ تھا کہ اب تک جو شمالی امریکہ کی آبادیات سے حاصل ہو رہا تھا اس کا نعم البدل افریقہ میں تلاش کیا جائے اور اس تجارت اور ذرائع کے استحصال کے لئے ضروری تھا کہ افریقہ سے غلاموں کی درآمد بند کر دی جائے۔

لیکن غلامی کے خلاف تحریک میں سب سے زیادہ حصہ شکر کی تجارت نے لیا کہ جو جزائر غرب الہند، کیوبا اور برازیل میں پیدا ہوتی تھی اور جس کی پیداوار میں غلام حصہ لیتے تھے۔ اس لئے جب برطانیہ کو شکر کی تجارت میں فائدہ ہوتا تھا تو غلاموں کی ہمدردی کے جذبات ٹھنڈے ہو جاتے تھے لیکن جب اس میں انہیں نقصان ہوتا تھا اور ان کی

مخالف یورپی طاقتیں خصوصاً فرانس یا اسپین، اس سے فائدہ اٹھاتی تھیں تو غلامی کی تحریک خاتمہ کے لئے زور پکڑ جاتی تھی۔

مثلاً فرانسیسی نو آبادی ہسپانولا میں سستی شکر پیدا ہونے لگی تو اس سے برطانوی شکر کے کھیتوں اور کارخانوں کے مالک پریشان ہو گئے اور انہوں نے فرانسیسی تاجروں کو نقصان پہنچانے کی غرض سے غلامی کے خلاف تحریک میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔ 1784ء میں ایک برطانوی پادری نے اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر برطانیہ افریقی غلاموں کو درآمد کر کے انہیں فرانسیسی مقبوضات میں فروخت کرتا رہا تو ان جزیروں کی زرخیزی اس قدر زیادہ ہے اور ان کے کھیت مالکوں کی زندگی اس قدر سادہ ہے کہ وہ بیس سال کے اندر اندر برطانوی شکر کی منڈیوں کو ختم کر دیں گے اس لئے غلاموں کی تجارت برطانیہ سے زیادہ اس کے دشمنوں کے لئے زیادہ سود مند ہے۔

برطانوی رویہ میں اس وقت پھر تبدیلی آئی جب فرانسیسی انقلاب کے بعد ہائٹی جو کہ فرانسیسی نو آبادی تھی اس کے تاجروں نے سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے چاہا کہ وہ فرانس سے اپنا رشتہ توڑ کر برطانیہ سے ملحق ہو جائیں۔ چونکہ ہائٹی کی پیداوار شکر تھی اور اس کو پیدا کرنے والے غلام تھے اس لئے برطانیہ کے لئے فکر کا موقع ہو تا کہ وہ غلامی کو ختم کرے یا باقی رکھے۔ ان حالات نے تحریک کو کمزور کر دیا۔ اسی دوران وہاں غلاموں کی زبردست بغاوت نے ان کے کھیتوں کو تباہ کر دیا جس کی وجہ سے برطانوی تاجروں کو پھر فائدہ ہو گیا چنانچہ 1792ء سے 1799ء تک برطانیہ میں غلامی کے خلاف تحریک انتہائی کمزور ہو گئی۔ اور اس تحریک کا سرگرم کارکن ولیم ولبر فورس بھی اس تحریک میں زیادہ فعال نہیں رہا اور 1800ء سے 1830ء تک غلامی کے خلاف کوئی تحریک برطانوی پارلیمنٹ میں پیش نہیں ہوئی۔

اس کے برعکس 1791ء سے 1807ء کے دوران برطانیہ نے غلاموں کی تجارت

زور شور سے شروع کر دی اور ایک بڑی تعداد افریقہ سے جزائر غرب الہند برطانوی جہازوں میں بھر کر آئی۔ یہاں تک کہ پرتگال نے برطانیہ کے مقابلہ میں کم غلاموں کو امریکہ میں در آمد کیا۔

لیکن انیسویں صدی کے شروع میں جزائر غرب الہند میں جو سیاسی اور معاشی تبدیلیاں آئیں ان کی وجہ سے کھیت مالکوں نے خود اس کو اپنے حق میں سمجھا کہ غلاموں کی تجارت کو کچھ سال کے لئے روک دیا جائے یا اسے مکمل بند کر دیا جائے۔ اس کی وجوہات یہ تھیں کہ اس دوران میں نئے جزائر میں کہ جہاں 1792ء سے 1799ء کے دوران غلاموں کو لایا گیا تھا وہاں شکر کی پیداوار پرانے جزیروں کے مقابلہ میں زیادہ ہونے لگی تھی اس لئے ان کے کھیت مالکوں نے غلامی کی مخالفت میں حصہ لیا۔ اس مخالفت میں زیادتی اس لئے بھی ہوئی کہ منڈیوں میں شکر کی زیادہ پیداوار کی وجہ سے مقابلہ سخت ہو گیا۔ ان نئے حالات کی وجہ سے 1804ء میں تحریک میں ایک بار پھر جان پڑ گئی اور ان کی مسلسل کوششوں سے 1807ء میں برطانیہ نے غلامی پر پابندی لگا دی لیکن برطانیہ اور اس کی مقبوضات میں اس کا مکمل خاتمہ 1833ء میں ہوا اور دوسری یورپی اقوام نے بھی آہستہ آہستہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت اپنے اپنے ملکوں اور مقبوضات میں غلامی کو ختم کر دیا۔

امریکہ میں غلامی کا خاتمہ خانہ جنگی کے بعد ہوا۔ (1860-1861ء) کہ جس کے امریکہ کے معاشرہ پر گہرے اثرات ہوئے۔

غلامی کی تاریخ کے ایک مورخ پیٹر جے پیرش (Peter J.PARISH) نے غلامی کے بارے میں جو رائے دی ہے اس سے اس کی تاریخی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ غلامی کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوتے اس حقیقت کو ماننا پڑے گا کہ اس کی بنیاد ناانصافی اور غیر انسانی بنیادوں پر تھی اور اس کے نتیجہ میں ظلم اور بربریت پیدا ہوئی۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ غلامی نے

انسانی تاریخ میں یہ ثابت کر دیا کہ انسان میں مزاحمت کے جذبات اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ وہ سختی و تشدد کے باوجود بھی کچلے نہیں جاسکتے ہیں اور یہ بھی کہ انسانی فطرت کس قدر لچک دار ہوتی ہے جو ہر ماحول کو اپنے لئے ساز گار کر لیتی ہے اور ہر قسم کی تکالیف اور مصیبتوں کو برداشت کرتے ہوئے زندہ رہنے کی خواہش کو برقرار رکھتی ہے۔

غلاموں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک طویل اذیت کے دور کو برداشت کیا اور اپنی غلامی کے باوجود اپنی کمیونٹی کی تشکیل کی اور اس میں ایک نیا کلچر تخلیق کیا۔ ان میں آزادی کا جذبہ تمام تشدد کے باوجود زندہ رہا یہاں تک کہ یہ آزادی انہیں حاصل ہو کر رہی۔ غلاموں کی تاریخ انسان کے شعور کو پختہ کرنے اور ان میں اس احساس کو پیدا کرنے کا ذریعہ ہے کہ ظالم اور مظلوم کی جنگ میں بالآخر مظلوم کامیاب ہوتا ہے اگرچہ اس جدوجہد میں ایسے ادوار بھی آتے ہیں کہ جو مایوسی اور ناامیدی پیدا کرتے ہیں مگر جدوجہد اور مزاحمت کے ذریعہ استحصال کا خاتمہ ہوتا ہے اور افراد اور لوگوں کی اجتماعی قربانیاں جو وہ آزادی اور حقوق کے لئے دیتے ہیں وہ رائیگاں نہیں جاتی ہیں۔ یہ غلاموں کی تاریخ کا وہ سبق ہے جو وہ ان آزاد لوگوں کو دیتا ہے کہ جو محرومی اور استحصال کا شکار ہیں۔

افریقہ کی لوٹ کھسوٹ

سولومن انکوئی

بہت سے مغربی مورخ یہ بات کہتے ہیں کہ یورپی اقوام کی آمد اور نوآبادیات کے قیام سے پہلے افریقہ کی نہ تو کوئی تاریخ تھی اور نہ ہی اس کا ماضی۔ اس نظریہ کو مقبول بنانے میں مشنریوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے کیونکہ وہ اس بنیاد پر افریقہ میں اپنے وجود اور سرگرمیوں کو جائز ثابت کرنا چاہتے تھے اور یورپی اقوام کی افریقہ میں آمد کو تہذیبی مشن کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے۔

افریقہ یک براعظم ہے جہاں پر کہ مختلف اقوام اور ثقافتیں پروان چڑھیں اور افریقہ کے لوگوں نے اب تک ایک یکساں ثقافت یا ترقی کو حاصل نہیں کیا ہے۔ جب ابتداء میں یورپی افریقہ میں آئے تو انہیں وہاں مختلف درجوں کی تہذیبیں ملیں۔ اس وقت کچھ قبائل غذا کو جمع کرنے کی اسٹیج پر تھے۔ کچھ زراعتی معاشرے تھے اور کچھ مویشیوں کو پالنے والے۔ اس براعظم میں کئی تہذیبیں پیدا ہوئیں اور ختم ہو گئیں۔ سلطنتیں اور حکومتیں آئیں اور چلی گئیں۔ یورپی لوگوں کی آمد سے بہت پہلے سون گائی، گھانا، بینن، آکزم، زمبادے، موروئی، اور نوبیا کی تہذیبیں عروج پر پہنچ کر ختم ہو گئیں تھیں۔

ہمارے موضوع سے متعلق جو اہم بات ہے وہ یہ ہے کہ افریقہ کے لوگ اس سے واقف تھے کہ کس طرح سے فطرت کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ شکار کرنے والے اور غذا جمع کرنے والے اس طرح سے رہتے تھے کہ زمین اور اس کے ماحول کو خراب نہ کریں، کیونکہ ان کی غذا کا سارا دارومدار ماحول کی بہتری پر تھا وہ فطرت سے صرف اتنا لیتے تھے کہ جس کی ضرورت انہیں ہوتی تھی۔ جو لوگ زراعت میں مشغول تھے وہ زمین کو احتیاط سے استعمال کر کے اپنی ضرورت کے مطابق اناج اگاتے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں زمین کی نزاکت کا احساس تھا اور وہ زمین کو کھاد دینے، ہل چلانے اور کاشت کے پلاٹوں پر وقت کے حساب سے کاشت کرنے کے علم سے واقف تھے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ افریقہ کے لوگ فطرت سے بہتر سلوک کر رہے تھے۔ وہ آب پاشی اور کھاد کے استعمال سے بخوبی واقف تھے اور اس وجہ سے کھیتوں میں زائد مقدار میں فصلیں پیدا کرتے تھے۔

لیکن وہ صرف غذا کی پیداوار ہی پر توجہ نہیں دے رہے تھے بلکہ وہ ایک اعلیٰ ثقافت بھی تخلیق کر رہے تھے۔ جس میں آرٹ، مجسمہ سازی، موسیقی، تعمیرات، اور فولاد اور شیشہ کا کام قابل ذکر ہے۔ افریقہ میں قدیم آثاروں سے جو آرٹ کے نمونے دستیاب ہوئے ہیں وہ افریقی تہذیب کی عظمت اور بڑائی کے زندہ شاہکار ہیں۔ علمی میدان میں بھی افریقی ترقی کر رہے تھے اور یا تو وہ اپنی زبانوں کے رسم الخط بنا رہے تھے یا اپنے ہمسایوں کے رسم الخط کو اختیار کر رہے تھے۔ اب تک جو افریقی رسم الخط ملے ہیں ان میں ایتھوپیا کا رسم الخط قابل ذکر ہے۔ افریقی ملکوں کے درمیان باہمی تجارتی رشتے تھے اور غیر مسلموں سے بھی ان کے روابط تھے اور افریقی تاجر مصر، مراکش، الجزائر، تیونس، اور لیبیا تجارتی سامان لے کر جاتے تھے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ افریقہ ایک فطری ارتقائی عمل میں تھا جبکہ یورپی اقوام یہاں پر آئیں۔

یورپی اقوام اور افریقہ

نوآبادیات سے پہلے قدیم افریقہ کے لوگ بحر روم اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کے بارے میں پوری معلومات رکھتے تھے۔ یونانی، رومی، اور عرب افریقہ کے بہت سے حصوں میں تجارت کیا کرتے تھے۔ عیسائیت اور اسلام کے ظہور کے بعد افریقہ نے مشرق وسطیٰ کے ملکوں سے اپنے ثقافتی روابط کو اور بڑھا لیا۔ مورخ اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ افریقہ میں نوآبادیات کا عمل آہستہ اور خاموشی کے ساتھ ہوا۔ اس کی دو وجوہات تھیں، ایک یورپ کے ممالک سے افریقہ تک سفر کی مشکلات بہت تھیں دوسرے اس وقت تک یورپ افریقہ کے وسائل اور دولت سے پوری طرح آگاہ نہیں تھا۔

ابتداء میں یورپ کے تاجر افریقہ کے ساحلوں پر وقتی طور پر قیام کرتے تھے، خصوصیت سے مغربی افریقہ کے ساحلوں پر اور یہ روابط رسمی تھے جیسا کہ سیسل ڈیوڈ نے کہا۔ یہ زمانہ باہمی دریافت کا تھا۔ آپس میں تصادم بہت کم ہوتے۔ وہ مقام کہ جہاں جہاز قیام کیا کرتے تھے اور غذا اور پانی لیا کرتے تھے وہاں شروع میں پرتگیزیوں نے اپنے مستقل قلعے اور کوٹھیاں بنائیں یہ پندرہویں صدی کے شروع میں ہوا۔ اس کے بعد جلد ہی پرتگیزی راس امید کی طرف سے ہندوستان گئے اور اس طرح انہوں نے مشرقی افریقہ کو دریافت کیا اور یہاں انہوں نے اپنے ٹھہرنے کے لئے قلعے تعمیر کرائے۔ ان میں آج کے کینیا میں "عیسیٰ کا قلعہ" اب تک موجود ہے۔ انگریز بینن میں سولہویں صدی کے درمیان پہنچے۔ اس مرحلہ کے بعد افریقہ کے اندرونی حصوں کی دریافت کا عمل شروع ہوا اور پھر غلاموں کی تجارت کی ابتداء ہوئی جس نے افریقہ کے معاشرہ کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

غلاموں کی تجارت

یورپی اور افریقہ کے لوگوں میں اس وقت تعلقات میں خرابی آئی جب انہوں نے

ان کی دولت کو لوٹنا شروع کیا۔ سولہویں صدی کے آخر میں پرتگیزیوں نے انگولا کی ریاست پر حملے کرنا شروع کئے اس سے غلاموں کی تجارت کی ابتداء ہوئی انہوں نے افریقیوں کو برازیل بھیجنا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک رہا۔ 1593ء سے 1700ء تک 3 ملیون تک افریقیوں کو نئی دنیا میں بھیجا گیا۔ 1701ء سے 1810ء تک غلاموں کی تجارت میں مزید ترقی ہوئی اور مزید 3 ملیون افراد غلام بنائے گئے۔ 1811ء اور 1870ء کے درمیان 109 ملیون افریقی گھربار سے محروم ہو کر جانوروں کی طرح فروخت ہوئے۔ ان میں سے کچھ امریکہ بھیجے گئے اور کچھ جزائر غرب الہند میں۔ غلاموں کی اس تجارت میں انگریز، فرانسیسی، ہسپانوی، پرتگیزی، جرمنی اور ولندیزی سب ہی شامل تھے۔ اس تجارت کا اثر افریقی معاشرہ پر کیا ہوا ہو گا اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں۔۔۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے تباہی آئی۔ نوجوانوں اور صحت مند نوجوانوں کو زبردستی لے جایا گیا اور جنہوں نے مزاحمت کی انہیں سزائیں دی گئیں یا مار ڈالا گیا۔ افریقیوں ہی کو افریقیوں کو پکڑنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ ان غلاموں کو نئی دنیا میں اس لئے بھیجا گیا کہ وہاں جا کر گرم استوائی علاقوں کی فصلیں جیسے شکر وغیرہ یورپیوں کے استعمال کے لئے پیدا کریں۔ اس پورے عمل میں افریقہ کی اپنی زراعت متاثر ہوئی۔ اس وقت تک افریقی آبادی زیادہ نہ تھی اور جب اس میں سے تقریباً ۱۰ ملیون کم ہو گئے تو اس کے اثرات تباہ کن ہوتے۔ کانگو کی آبادی آدھی رہ گئی۔ یہ غیر انسانی تجارت یورپ کے لئے اور خصوصیت سے برطانیہ اور فرانس کے لئے تو بہت دولت لے کر آئی اور ان کے ہاں صنعتی انقلاب اس کی وجہ سے ممکن ہوا مگر اس سے افریقہ میں غربت اور تباہی آ گئی۔

حملے اور تقسیم

غلاموں کی تجارت کا خاتمہ، یورپی امپیریل ازم کا عروج اور یورپیوں کی فتوحات

نے یورپ اور افریقہ کے تعلقات کو ایک نئی جہت دی۔ انیسویں صدی کے شروع میں منڈیوں کی تلاش اور خام مواد کا حصول یورپی صنعتوں کے لئے ضروری تھا۔ اس وجہ سے رائل نائجر کمپنی، دی برٹش ایسٹ افریقہ کمپنی، دی برٹش ساؤتھ افریقہ کمپنی، اور فرانسیسی، ولندیزی، اور جرمن کمپنیاں قائم کی گئیں۔ ان کمپنیوں نے اسلحہ کی مدد سے افریقہ کی سرزمین میں اپنے سرمایہ کو بڑھایا اور اس کی حفاظت کی۔ اس کے ساتھ ہی آباد کاروں اور مشنریوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ نوآبادیات کا معاشی نظام ان بنیادوں پر تھا کہ صرف محدود تعداد میں آباد کاروں، افسروں اور تاجروں کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔

یورپی لوگ جس قدر افریقہ کے اندرونی حصوں میں گئے اسنا ہی انہیں اندازہ ہوتا چلا گیا کہ افریقہ کس قدر دولت سے مالا مال ہے۔ ان میں معدنیات اور خط استوائی کی فصلیں شامل تھیں۔ دولت کی اس لوٹ کھسوٹ میں یورپی اقوام میں آپس میں رقابت و دشمنی پیدا ہوئی اور اس عہد میں افریقہ کو بری طرح لوٹا گیا۔ انگریز، فرانسیسی، جرمن، بیلجین، اطالوی، پرتگیزی، اور ہسپانوی تمام اقوام افریقہ کے کیک سے ایک ایک ٹکڑا چاہتی تھیں۔

1884-85 میں برلن کانفرنس میں اس بات کا فیصلہ ہوا کہ ہر قوم کے حصہ میں کیا آنا چاہیئے۔ اگرچہ اس کانفرنس سے پہلے یہ اقوام افریقہ میں اپنے حلقہ اثر میں اقتدار قائم کر چکی تھیں مثلاً فرانس نے شمالی افریقہ میں 1830 میں الجزائر پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا تھا اور برطانیہ زیریں مصر اور بحر احمر پر قبضہ کر کے اپنے لئے ہندوستان کا راستہ محفوظ کر چکا تھا۔

لیکن یورپی اقوام نے افریقہ پر آسانی سے قبضہ نہیں کیا کیونکہ افریقہ کے لوگوں نے ہر جگہ زبردست مزاحمت کی اور یورپیوں کو محض اس لئے کامیابی ہوئی کہ ان کے ہتھیار جدید اور برتر تھے۔ فرانس کو بیس سال کا عرصہ لگا کہ جس میں اس نے افریقہ کو شکست دی۔ برطانیہ نے موجودہ جنوبی افریقہ کو فتح کرنے کے لئے 9 بڑی جنگیں لڑیں اور

1878ء میں انہیں زولو قبیلہ نے بری طرح شکست دے دی تھی۔ اسی طرح جرمنوں، اطالویوں اور ولندیزیوں کو مقامی لوگوں سے سخت جنگیں لڑنا پڑیں تب جا کر وہ انہیں کچل سکے۔ اس پورے عرصہ میں افریقہ میں کہیں بھی مکمل امن وامان قائم نہیں رہا اور وقتاً فوقتاً بغاوتیں ابھرتی رہیں۔ اگر 1880ء سے 1900ء کے زمانہ کو فتوحات کا زمانہ کہا جاسکتا ہے تو 1900ء سے لے کر 1920ء تک وقت وہ ہے کہ جس میں نوآبادیاتی نظام مستحکم ہوا۔

نوآبادیاتی دور کے اثرات

بیسل ڈیوڈسن (1973ء) نے صحیح لکھا ہے کہ "نوآبادیاتی حکمرانوں نے چند سڑکیں اور ریلوے لائنیں بنائیں اور کچھ کانوں اور کھیتوں کو آباد کیا (اگرچہ یہ بھی اپنی سہولت اور دولت کے لئے تھا) اور ادھر ادھر تھوڑی بہت تعلیم اور سماجی کام بھی کئے مگر اس کے مجموعی طور پر جو اثرات ہوئے وہ ٹوٹ پھوٹ کے تھے۔ اپنی نو آبادیات کو انہوں نے ٹکڑے کیا، جوڑا نہیں۔"

سرکاری ریکارڈ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ 1921ء اور 1932ء کے درمیان بیلجیم کانگو میں جو ریلوے لائنیں بچھائی گئیں ان میں ایک لاکھ ستائیس ہزار دو سو پچاس (127-250) مزدوروں سے بیگار میں کام کروایا گیا اور جب ریلوے مکمل ہوئی تو اس وقت تک بیس ہزار لوگ مر چکے تھے لیکن اس کے علاوہ ان نقصانات کا اندازہ نہیں لگایا گیا کہ جو ان لوگوں کو زبردستی ان کے خاندانوں سے جدا کرنے کے نتیجہ میں ہوئے اور اس بڑی تعداد کے اجڑنے سے جو سماجی اور معاشی اثرات ہوئے اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔

نوآبادیات کے ساتھ ہی زراعت میں بڑے بڑے کھیتوں کا رواج ہوا جن کے مالک یورپی آباد کار تھے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ افریقیوں نے نہ صرف اپنی زمین کھوئی

بلکہ انہیں ان زمینوں پر زبردستی کام کرنے پر مجبور کیا گیا۔ یہ تمام براعظم افریقہ میں ہوا، کینیا، موزنبیق، جنوبی افریقہ، نمبیا، انگولا اور زمبابوے میں۔ ان علاقوں میں جو آب وہوا کے لحاظ سے یورپیوں کے لئے رہائش کے قابل نہیں تھے وہاں انہوں نے ایسی فصلوں کو روشناس کرایا جو یورپ کی منڈیوں اور ضرورت کے لئے تھیں۔ ان میں ربڑ، کوکو، کافی، چائے، شکر۔ ٹروپیکل پھل، اور پام آئل قابل ذکر ہیں۔ الجزائر میں ساحل کی زرخیز زمینوں کو فرانسیسیوں نے انگور کی کاشت کے لئے وقف کر دیا تاکہ فرانس میں ان سے کشید کی ہوئی شراب درآمد کی جا سکے۔ فرانسیسیوں کی آمد سے پہلے یہاں پر مختلف اناج بوئے جاتے تھے اور بھیڑ بکریوں کو پالا جاتا تھا اور یہ ان کی غذائی ضروریات کو مکمل طریقے سے پورا کرتا تھا۔ الجزائر میں جب کہ یورپی اقتدار اپنے عروج پر تھا اس وقت ایک ہزار آباد کار قابل کاشت زمین کے ساتویں حصہ کے مالک بن گئے تھے اور افریقیوں کو دھکیل کر بنجر اور غیر آباد زمینوں پر آباد کر دیا گیا تھا۔

نو آبادیاتی حکمرانوں نے بڑی بڑی کمپنیوں کو اس بات کی اجازت دی کہ وہاں کانوں میں کھدائی کریں۔ اس وجہ سے ایک مرتبہ پھر افریقی مزدور کا استحصال ہوا کہ وہ اپنی ہی معدنیات کی دولت کو غیر ملکیوں کے حوالے کرے۔ 1900ء میں وہ پورا علاقہ جس میں چاڈ، گابون، سینٹرل افریقہ اور کانگو شامل ہے چار کمپنیوں کو رعایت کے ساتھ دیا گیا۔ اور یہ چارٹر 30 سال کے لئے تھا۔ یہ کمپنیاں اس چارٹر کے تحت اس بات کی مجاز تھیں کہ وہ اس تمام پیداوار سے منافع کمائیں جو وہ یہاں سے حاصل کریں۔ اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک مصنف نے اسے "معاشی لوٹ کھسوٹ" کہا۔ ان مراعات نے ان کمپنیوں کو افریقی زندگی اور افریقی محنت کشوں کے لئے مسلسل خون چوسنے والا ادارہ بنا دیا۔ ان کے ماحولیات پر کیا اثرات ہوتے یہاں فی الحال اس کا ذکر نہیں کیا جاتا ہے۔ نو آبادیاتی حکمران ان کمپنیوں سے 15 فیصد ٹیکس لیا کرتے تھے۔ لوگوں سے جو "پول ٹیکس" لیا جاتا تھا وہ ربڑ اور ہاتھی دانت کی شکل میں ہوتا تھا۔ کانگو میں بیلجیم کے بادشاہ

لیوپولڈ جو پورے ملک کا نجی طور پر مالک تھا اس نے یورپی کمپنیوں کو کانگو کی زرعی زمین، جنگ اور بیگار کے تمام حقوق دے دیئے اس کی وجہ سے تمام علاقہ پیداوار اور لوگوں کی آبادی سے اجاڑ ہو کر رہ گیا۔

افریقہ کی لوٹ کھسوٹ کا مطلب یہ بھی تھا کہ اس براعظم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے یا ان لوگوں کو زبردستی آپس میں ملایا جائے کہ جن کے درمیان کوئی باہمی ثقافت نہ تھی اور نہ تاریخی طور پر ان کا ایک دوسرے سے تعلق تھا۔ اس تقسیم کے نتیجہ میں صنعتی ترقی رک گئی اور نوآبادیاتی مفادات نے افریقہ کی معیشت کو اپنے مفادات سے جوڑ دیا۔ یہاں پر ایک ایسی اقلیت پیدا ہوئی کہ جو ثقافتی اور تعلیمی لحاظ سے یورپی ممالک سے وابستہ تھی اور جن کی عادات و اطوار بھی یورپی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ اپنی ضروریات کے لئے پیداوار نہ کر سکے تو انہوں نے یورپ کی برآمدات پر انحصار کرنا شروع کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے یورپ کی صنعت کے لئے زیادہ سے زیادہ خام مواد بھیجنا شروع کر دیا تاکہ اس سے وہ زرمبادلہ حاصل کر سکیں اور اس زرمبادلہ سے یورپ سے ان اشیاء کو درآمد کر سکیں جو ان کی جدید زندگی کی ضروریات کے لئے لازمی بن گئی تھیں۔

آج افریقہ اپنی معدنیات کی کانوں، کھیتوں اور فصلوں سے اتنا پیدا کرتا ہے کہ جو افریقہ کی اپنی ضروریات سے زائد ہے۔ پھر افریقہ کیوں بھوکا مر رہا ہے؟ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ افریقہ کے لوگوں کا اپنے وسائل پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ فائدہ اٹھانے والے افریقی نہیں بلکہ امریکی اور یورپی ہیں جو اس کے وسائل کو بری طرح سے لوٹ رہے ہیں۔

افریقہ میں معدنیات کی بہتات ہے۔ تانبا، جواہرات، سونا، ٹن، لوہا، یورینیم، اور کوئلہ کثرت کے ساتھ نکالا جاتا ہے کیونکہ انہیں ڈر ہے کہ حالات جلد ہی بدل جائیں گے اور ان کی اجارہ داری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ آج افریقہ روئی، کافی، چائے، پھل،

کوکو، ربڑ، اور تازہ سبزی برآمد کرتا ہے اور خود اس کے باوجود بھوکوں مرتا ہے۔ اس خام مال کی قیمتوں کا تعین مغرب والے کرتے ہیں اور افریقہ اس پر مجبور ہے کہ وہ یہ خام مال زیادہ سے زیادہ برآمد کرے اور اس کے بدلے میں مغرب سے مشینیں اور دوسری اشیاء خریدے۔ صنعتی پیداواری اشیاء کی قیمتیں ہمیشہ زیادہ ہوتی رہتی ہیں جب کہ افریقہ کی زراعتی اور معدنیات کی پیداوار اس مقابلہ میں سستی ہوتی ہیں۔

ساحل کا علاقہ ماضی میں بھی اور اب بھی بھوک سے دوچار رہا ہے جبکہ 84-1983 میں ساحل کے 5 ممالک نے 154 ملیون ٹن روئی کے دھاگے پیدا کئے۔ انہوں نے ایک دوسرا ریکارڈ قائم کیا جب 1984 ء میں انہوں نے 77 ملیون ٹن اناج درآمد کیا۔ لیکن نوآبادیاتی دور سے زراعت اور کاشت کی پالیسی یہ رہی ہے کہ صرف وہ فصلیں اگائی جائیں جن کی یورپ کو ضرورت ہے۔ اس لئے کینیا کا ایک کسان چاہے کتنا ہی خواہش مند ہو کہ وہ اناج کاشت کرے مگر وہ کافی اور چائے پیدا کرنے پر مجبور ہے۔ سوڈان جو کہ موجودہ زمانہ میں قحط کا شکار ہے اس بات پر مجبور ہے کہ اپنی زراعتی زمین پر روئی کاشت کرے۔ ان تمام مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ افریقہ میں اب تک نوآبادیاتی دور کی روایات قائم ہیں اور وہ مغربی معاشی نظام سے جکڑا ہوا ہے اور مکمل طور پر ان پر انحصار کرتا ہے۔ افریقہ کو مغرب سے امداد بھی ملتی ہے لیکن یہ مدد کوئی واضح نتائج پیدا کرنے میں ناکام ہو گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امداد کی کافی رقم مدد دینے ولی ایجنسیوں پر خرچ ہو جاتی ہے اور باقی مغرب کی چیزیں خریدنے پر لہٰذا یہ کوئی دیرپا اثرات نہیں چھوڑتی۔

افریقہ کی لوٹ کھسوٹ کے جدید اثرات کیا ہوتے ہیں؟ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ نوآبادیاتی نظام کے اثرات افریقہ پر تباہ کن ہوئے۔ اس سے اس کا فطری ارتقائی ترقی کا عمل رک گیا اور افریقہ کی معیشت مغرب سے بندھ جانے کے بعد انتہائی کمزور ہو گئی۔ افریقہ یورپ کے لئے ہے افریقیوں کے لئے نہیں۔ قحط اور خشک سالی کے باوجود افریقہ

اب بھی پیداواری عمل میں متحرک ہے اور یورپ کو زراعتی اور معدنیاتی پیداوار بڑی مقدار میں بھیج رہا ہے لیکن خود اس کا منافع برابر گھٹ رہا ہے اور معدنیات کی کمی آگے چل کر افریقہ کو مزید بھوک اور افلاس دے گی۔ افریقہ آج جس اذیت اور دکھ میں مبتلا ہے اس کی وجہ یورپ کی طمع اور لالچ ہے۔

افریقہ میں قحط

جینی ہے منڈ

بائبل کے لحاظ سے قحط وہ عمل ہے جو کہ خدا کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے قحط کی تمام ذمہ داری خدا پر ہو جاتی ہے اور انسان تمام فکروں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو قحط اچانک نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ علیحدہ سے کوئی ایک حادثہ یا واقعہ ہوتا ہے بلکہ یہ معاشی ور سیاسی واقعات کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ س لئے اس کا حل اسی وقت دریافت ہو سکتا ہے جب کہ اس کی وجوہات کو تلاش کیا جائے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ قحط کے دوران جب امدادی کارروائی کی جاتی ہے تو اس وقت قحط کو ایک فطری تباہی سمجھا جاتا ہے اور اس کے حقیقی مسائل کو اس طرح سے چھپا دیا جاتا ہے۔

حقیقت میں قحط کوئی علیحدہ سے ہونے والا واقعہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی غیر معمولی ہوتے ہیں جیسا کہ ہم میں سے اکثر فرض کر لیتے ہیں۔ افریقہ میں ساحل پر جو قحط پڑے وہ اس وجہ سے ہوئے کہ ان علاقوں کی زمینوں کو فرانسیسیوں نے اپنے منافع کے لئے استعمال کیا اور نی گرے میں جو قحط پڑے ان کی وجہ ام ہارا اقتدار تھا کہ جنہوں نے، اس علاقہ کی طرف توجہ نہیں دی۔ اسی طرح برطانوی استحصال نے ہندوستان میں کئی

قحطوں کو جنم دیا۔ آئرلینڈ کی ایک چوتھائی آبادی قحط کے دوران اس لئے مر گئی کہ وہاں سے اناج انگلستان کو درآمد کر دی گئی اور آلوؤں کی قلت ہو گئی۔

امرتیا سین نے بنگال کے قحط کے تین پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مارچ 1943 سے نومبر تک جاری رہا۔ اور اس زمانہ میں بھوک کی شدت بہت زیادہ رہی۔ لیکن سین کے تجزیہ میں یہ زمانہ قحط کا دوسرا دور ہے اور اس سے پہلے پہلا عہد ہے جس میں کہ معاشی تباہی نے بنگال کی آبادی کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اور یہی معاشی بربادی قحط کا باعث بنی اور بھوک سے مرنے والوں کی تعداد تیسرے عہد میں جا کر بڑھی۔ جب کہ بھوک کا خراب دور ختم ہو چکا تھا لیکن جب وبائیں پھیل چکی تھیں۔

اس مرحلہ پر یہ سوال اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ کیا قحط اور روزمرہ کی بھوک میں کوئی فرق کیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ پس ماندہ معاشروں میں بیماریاں اور غذا کی کمی یا غیر صحت مند کھانا غریب لوگوں کو مسلسل موت سے ہم کنار کرتا رہتا ہے اس لئے ایک نہ نظر آنے والا قحط ان ملکوں میں ہمیشہ ہی رہتا ہے۔

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خشک سالی کی وجہ سے قحط پڑتے ہیں۔ مگر یہ غلط ہے۔ بارش کا ہونا یا نا ہونا افریقہ کے صحراؤں میں ہمیشہ سے غیر یقینی رہا ہے اور یہاں کے لوگ اس خشک سالی سے مقابلہ کرنا جانتے ہیں مگر جب ان کا روایتی دفاع توڑ دیا جائے تو اس صورت میں یہ خشک سالی ان کے لئے مصیبت بن جاتی ہے۔ ٹی گرے میں قحط اس لئے پڑے کہ ایتھوپیا کی فوجوں نے کسانوں کو کھیتی باڑی نہیں کرنے دی اور جب کاشت کا وقت گزر گیا تو قحط کا ہونا لازمی ہو گیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قحط کی ایک وجہ یہ ہے کہ زمین پر زیادہ بوجھ ڈالا جاتا ہے اور زیادہ کاشت کی جاتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں زمین بنجر ہو جاتی ہے۔ یا یہ الزام کسانوں، کاشت کاروں اور خانہ بدوشوں پر لگایا جاتا ہے کہ وہ جنگلوں سے درخت کاٹ کر اسے

پیدا کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ بھی قحط کی وجہ نہیں۔ ایک عرصہ تک کسانوں اور چرواہوں نے اپنے ماحول کو پاک و صاف رکھا لیکن موجودہ زمانہ میں تجارتی مفادات کی وجہ سے ماحول میں خرابی پیدا ہوئی۔ جنگلوں سے درخت کاٹنے میں یا پہاڑوں سے معدنیات نکالنے میں بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں کا مفاد ہے۔ اس میں غریب و عام آدمی بحیثیت مزدور شریک ہوتا ہے۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ قحط کی وجہ آبادی کا بڑھنا ہے۔ کیونکہ آبادی زیادہ ہو گئی اور اس کے لئے غذا کے وسائل کم ہیں۔ اس لئے اس کا بہترین حل یہ ہے کہ آبادی کی روک تھام کی جائے اور بھوک سے نجات پائی جائے۔ لیکن افریقہ کے ملکوں میں آبادی زیادہ نہیں ہے اور اس کے مقابلہ میں وہاں غذا کے وسائل بہت ہیں۔ لیکن مسئلہ صرف یہ ہے کہ ان وسائل کا استعمال نہ تو باقاعدہ سے ہوتا ہے اور نہ ہی ان کی تقسیم مناسب ہے۔ ان وسائل کا ایک بڑا حصہ مغرب کو بھیج دیا جاتا ہے۔ جب کہ خود ان ملکوں کے رہنے والے ان سے محروم رہتے ہیں۔

افریقہ کے ملکوں پر ایک الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ یہ آزادی کے بعد سے اپنے انتظامات اور معاملات کو بہتر طریقہ سے نہیں حل کر سکے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ نوآبادیاتی دور میں حالات بہتر اور پرسکون تھے، اور دوسرے یہ کہ آزادی کے بعد جن لوگوں نے افریقہ کے ملکوں پر حکومت کی وہ نااہل تھے اور ان کی نااہلیت کی وجہ سے غذا کی کمی ہوئی۔ یہ دونوں باتیں یورپی تعصب کو ظاہر کرتی ہیں۔

صورت حال اس کے برعکس یہ ہے کہ نوآبادیاتی دور میں کسانوں کو ایسی فصلیں کاشت کرنے پر مجبور کیا گیا کہ جن کی مانگ یورپ کی منڈیوں میں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تو یہ اپنی پیداوار کی خرید کے لئے مغرب کے محتاج ہو کر رہ گئے۔ دوسرے انہوں نے اپنی ضروریات کے لئے اناج اور دوسری اشیاء پیدا نہیں کیں۔ اس وجہ سے

کئی علاقوں میں قحط عام ہو گئے، آج بھی صورت حال تبدیل نہیں ہوئی ہے اور ان کے حکمران یا تو اپنے اقتدار کے لئے مغرب کی بات مانتے ہیں یا ان پر امداد اور "فوجی طاقت" کا دباؤ ہوتا ہے کہ وہ ملکی مفادات کی بجائے غیر ملکی مفادات کو ترجیح دیتے ہیں۔

ایک تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ غیر ملکی امداد کے ذریعہ مسئلہ کا حل ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ لیکن تجزیہ کیا جائے تو یہ صورت حال سامنے آتی ہے کہ جو بھی امداد دی جاتی ہے اس کا فائدہ بھی امداد دینے والے ملک کو ہوتا ہے، مثلاً برطانوی مدد کی یہ شرائط ہوتی ہیں کہ برطانوی اشیاء خریدی جائیں۔ ان کے لوگ ملازم رکھے جاتے۔ اور ان کی فرموں سے معاہدے کئے جائیں۔ اس امداد کی کئی خرابیاں ہوتی ہیں مثلاً اکثر کا تعلق صرف بڑے شہروں سے ہوتا ہے دیہات کی آبادی سے نہیں زراعتی امداد میں فصلیں درآمد کر دی جاتی ہیں، غذائی امداد میں زائد مقدار اناج بھیج دیا جاتا ہے۔ اس طرح اس امداد کے نقصانات ہی ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ اس کی وجہ سے امداد لینے والا ملک غذائی پیداوار میں خود کفیل نہیں ہوتا اور اس کی اندرونی منڈیاں متاثر ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی وجہ سے درآمدی اشیاء کا ایک ذائقہ پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے آئندہ بھی ان پر انحصار کیا جانے لگتا ہے۔

ایک مفروضہ یہ ہے کہ ترقیاتی منصوبے معاشی خوش حالی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن دیکھا یہ جائے کہ ان ترقیاتی منصوبوں سے مراد کیا ہے؟ ان میں اکثر منصوبے افریقہ کی صورت حال اور اس کی ثقافتی زندگی سے باخبر ہو کر نہیں بنائے جاتے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ان میں افریقی عورت کے اہم کردار کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ یورپی لوگ اپنے نقطہ نظر سے یہ سوچ لیتے ہیں کہ فیملی میں فیصلہ کرنے والا صرف مرد ہوتا ہے۔ اس لئے ساری امداد "مرد" کے لئے ہوتی ہے۔ افریقہ میں صورت حال یہ ہے کہ مرد اگر فصل کاشت کرتا ہے تو عورت اس کا انتظام کرتی ہے اور اس کی فروخت کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اس لئے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان منصوبوں سے عورت کو علیحدہ کر کے

افریقہ کی زراعتی حالت خراب ہوئی اور قحط کی صورت حال پیدا ہوئی۔

دیکھا جائے تو اس وقت افریقہ کے جو مسائل ہیں وہ ان سیاسی فیصلوں کا نتیجہ ہیں کہ جو انسانوں نے کئے اور اس لئے ان کا حل بھی ممکن ہے۔ افریقہ کے پاس زمین ہے اور اس کے وسائل لامحدود ہیں۔ اس لئے وہ اس قابل ہے کہ اپنے لوگوں کو غذا مہیا کر سکے۔ اس کا سب سے اہم ذریعہ اس کے کسان ہیں۔ جب تک ان کی رسائی زمین تک نہیں ہو گی اور جب تک زراعت اور اس کے انتظام میں ان پر بھروسہ نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت تک غذائی صورت حال بہتر نہیں ہو گی۔

Finley, M.I.: Amciemt Slavery and Modern Ideology. Pemguim, 1980.

Manning, Patrick : Slavery and African Life Cambridge, 1990

Parish, j Peter : Slavery : History and Historians Harper and Row, New York, 1989.

Price, Richard : Alabi's World, Johns Hopkins, 1990

Williams, Eric : Capitalism and Slavery CHapel Hill, 1944

The Indian Historical Review (Special Issue on Slavery) Val. XV, No. 1-2 (1988 and 1989)

تاریخ اور نسل پرستی

گورڈن چائلڈ

قدیم عہد میں یونانیوں اور رومیوں کا منطقی طور پر یہ سوچنے کا انداز صحیح تھا۔ وہ اس طرح سے سوچتے تھے کہ ایرانیوں، مصریوں، لیکٹوں اور جرمنوں کی شکل و شباہت اور جسمانی خصوصیات فطری اور پیدائشی طور پر ان سے بالکل مختلف ہیں اس لئے ان کے کردار میں بڑا فرق ہے۔ افلاطون اور ارسطو نے یونانیوں کی فطری برتری کے دعویٰ کی تصدیق کرتے ہوئے اس کا اظہار کیا کہ وہ وحشیوں سے افضل ہیں۔ ارسطو کا یہ نظریہ کہ کچھ لوگ فطرت کی جانب سے غلام پیدا کئے جاتے ہیں تاکہ وہ یونانیوں کی خدمت کر سکیں اس نظریہ کی عکاسی کرتا ہے۔

یہودیوں کی قومی تاریخ میں، یہودیوں کو خدا کی پسندیدہ مخلوق کا درجہ اس لئے ملا کہ خدا اور ابراہیم اور اس کی اولاد میں ایک ابدی معاہدہ ہو چکا ہے'' اس کے تحت برتری کے اوصاف اور خصوصیات۔ یہودی والدین کی جانب سے ان کے بچوں میں بطور وراثت آجاتی ہیں اور وہ مستقل طور پر اعلیٰ و افضل رہتے ہیں۔

مغرب میں موجودہ نسل پرستی کے جو نظریات آتے ہیں ان کی جڑیں دو تاریخی خیالات میں ہیں اول یہ کہ یونانیوں اور رومیوں کو فطرت نے برتر بنایا اور دوم یہ کہ یہ

برتری یہودیوں کو خدا کی جانب سے ملی۔ جب پندرہویں صدی میں یورپی اقوام کا تعلق افریقہ، ہندوستان اور امریکہ کے باشندوں سے ہوا تو انہوں نے ان نظریات کو وہاں پر اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے استعمال کیا اور اس طرح سے بائبل کے ماننے والے عیسائیوں نے خدا کے احکامات کی پیروی کرتے ہوئے، وعدہ کی ہوئی زمین پر قبضہ کیا اور انہوں نے غیر یورپی باشندوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو کہ یہودیوں نے فلسطین کے کنعانی باشندوں کے ساتھ کیا تھا اور انہیں لکڑی جمع کرنے اور پانی بھرنے والوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ جب یورپیوں میں یہ نظریہ جڑ پکڑ گیا تو پھر ان کے ضمیر کو اس سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی کہ جب انہوں نے امریکہ کے قدیم باشندوں کا قتل عام کیا اور افریقہ کے سیاہ فام باشندوں کو وہاں غلام بنا کر لے آئے۔

نسل کے بارے میں یہ مبہم نظریات اور مفروضے اٹھارویں صدی میں نشوونما پا کر اور زیادہ طاقت ور ہوئے۔ ہرڈر نے اس بات پر زور دیا کہ نسلی کردار ایک مستقل خصوصیت ہے اور یہ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اس کا جملہ ہے کہ "چین کا آدمی ہمیشہ چینی رہتا ہے" فرانسیسی انقلاب اور جرمنی، فرانس، اور برطانیہ کی رومانوی تحریکوں اور انقلاب کے نعروں، آزادی، مساوات اور اخوت کے جواب میں نسل پرستوں نے جن نظریات پر زور دیا وہ یہ تھے کہ ہر قوم تاریخی طور پر جداگانہ کردار کی حامل ہوتی ہے۔ اور اس وجہ سے ان کے سیاسی ادارے، سماجی عادات و روایات دوسروں سے علیحدہ ہوتی ہیں۔ اس طرح سے وہ یورپی اقوام کی علیحدگی اور ان کے اداروں کی برتری کو ان کے کردار کی خوبیوں سے متعلق کرنا چاہتے تھے۔

جن مورخوں نے ان افکار کو تاریخ نویسی میں داخل کیا۔ انہوں نے بڑی سادگی سے مختلف زبانیں بولنے والے گروپوں کو "قومیتوں" کے نام سے پکارا اور یہ ثابت کیا کہ یہ قومیتیں اپنی خصوصیات کی بنا پر پوری تاریخ میں علیحدہ و خود مختار ہیں اور اس طرح سے انہوں نے تاریخ کو اثر انداز کیا۔ یہ تحریک دراصل فرانسیسی انقلاب اور نپولین کی جنگوں

کے نتیجہ میں قوم پرستی کی شکل میں وجود میں آئی اور بعد میں اسے سائنسی بنیادوں پر شکل دینے کے لئے نئے ابھرتے ہوئے علم بشریات اور ڈارون کے علم حیوانیات سے مضبوط بنایا گیا

علم حیوانیات کے تحت جانوروں میں سب سے زیادہ باشعور جانور انسان ہے اور یہ جانوروں کی دوسری اقسام کی طرح سے کئی قسم کی نسلوں میں تقسیم ہے اور یہ تقسیم مستقل اور نہ تبدیل ہونے والی ہے۔ اس تقسیم کو زبان، رنگ اور قد ایک مستقل حیثیت دیتا ہے۔ اس بات پر سب متفق تھے کہ جسمانی ساخت و حیثیت ایک نسل کو بناتی ہے۔ اس زمانہ میں ایک فرانسیسی کومے داگوبینا نے نورڈک نسل کا نظریہ پیش کیا جس کے تحت لمبے قد اور سنہری بالوں والی نسل کے لوگ یورپی اقوام میں سب سے زیادہ باعمل اور تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ایک اور فرانسیسی والا پوشہ نے آریہ نسل کی برتری کا نظریہ پیش کیا جسے بعد میں اختیار کیا گیا اور ماہر لسانیات، علم حیوانیات، آثار قدیمہ، مورخوں اور صحافیوں نے اسے مقبول بنانے میں مدد دی۔

ہٹلر کے زمانہ میں اس نظریہ کو اس کے وزیر فیرک نے اسکول کے نصاب میں داخل کیا۔ اس نظریہ کے تحت یہ ثابت کیا گیا کہ تہذیب و تمدن کی تمام ترقی جو آرٹ، سائنس اور سیاسی اداروں میں ہوئی۔ صرف یورپ ہی میں نہیں بلکہ کلاسیکی زمانہ قدیم میں ہندوستان، چین اور شاید امریکہ میں بھی جو ترقی ہوئی۔ اس کی وجہ نورڈک، آرین اور جرمن نسلیں ہیں۔ جو کہ فطری طور پر حکمراں نسلیں ہیں۔ آثار قدیمہ اور علم لسانیات کی مدد سے فیرک نے یہ ثابت کیا کہ پہلی متمدن ریاستیں جو مصر اور عراق میں قائم ہوئیں۔ انہیں نورڈک فاتحین نے قائم کیا تھا اور جب آریوں کا ریلا آیا تو انہوں نے ہیٹی اور ان کی سلطنتیں قائم کیں اور یونان و روم کی تہذیبوں کو پیدا کیا۔ ایک اور مفکر فون تے ون نے کہا کہ اگرچہ سمیریا والوں نے ریاضی کے بہت سے مسائل حل کئے مگر اس کے باوجود انہیں سائنس کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ بلکہ آرین برہمنوں کو

جنہوں نے مذہبی موضوعات پر لکھا۔ انہیں وہ صحیح سائنسی علم قرار دیتا ہے۔

آریہ نسل کی برتری کے نظریہ کو انگریزی مورخوں خصوصیت سے کارلائل نے بڑی خوشی سے قبول کیا، کیونکہ اینگلو، سیکسن آخر کار جرمن قبائل سے تھے جو کہ نورڈک نسل کے سنہری بالوں والے تھے۔ اس نظریہ نے برطانوی امپیریل ازم اور جرمنوں کے مشرق کی طرف دباؤ کی تحریک کو تقویت دی۔ موجودہ صدی میں یہ نظریہ امریکہ میں بھی بڑا مقبول ہے کیونکہ اس سے سیاہ فام باشندوں کو نسلی طور پر علیحدہ رکھ کر انہیں مراعات سے محروم رکھا جا سکتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وقتی طور پر تھوڑے عرصہ کے لئے نسل پرستی کے جذبات میں کمی آئی مگر جنگ کے بعد پھر کسی نہ کسی شکل میں ان کا عروج ہوا۔ سر آرتھر کیتھ نے اس نظریہ کو "گول سر اور لمبوترے سر" کے ذریعہ پیش کیا۔ اس کے خیال میں 1915ء میں برطانیہ کے حکمراں طبقے لمبوترے سر والے نورڈک نسل کے نہیں تھے، بلکہ گول سر والے تھے جو "بیکر نسل" کے تھے اور غالباً ان کی زبان آریوں کی ہوگی جب کہ انہوں نے 1800 ق۔م۔ میں برطانیہ پر حملہ کیا تھا۔

اس دوران میں گوبینو کے نظریہ کو ڈارون کے پیش کردہ خیال "طاقتور کی بقا" سے مزید تقویت ملی۔ قومیں اور نسلیں بھی جانوروں کی طرح کئی قسموں میں تقسیم ہیں اور ان میں جنگ و جدل "بقا کی جدوجہد" ہوتی ہے۔ فتح اور کامیابی کا مطلب ہوتا ہے "بقا" اور یہ اس بات کی دلالت ہے کہ اس قوم یا نسل میں بقا کے لئے توانائی اور قوت ہے۔ اس کے تحت جنگ تاریخ کا ایک اہم موضوع قرار پاتا ہے جو کہ ایک فطری عمل ہے اور اس میں فتح برتری کی ایک سائنسی دلیل ہے۔ اس نقطہ نظر سے جنگ میں جو قتل عام ہوتا ہے، لوٹ مار ہوتی ہے اور خون ریزی کا سامنا ہوتا ہے وہ سب نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور اسے فطرت کا ایک شاندار عمل کہا جاتا ہے جو کہ ایک تنظیم اور ترتیب پیدا کرتا ہے۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ یہ نظریہ امپیریل طاقتوں اور قوموں میں مقبول

رہا، مثلاً "کیلٹوں نے ریچھوں اور بھیڑیوں کو بھگا دیا، اینگلو سیکسن نے کیلٹوں کو بھگا دیا "

موجودہ زمانہ میں "جینیٹک"، کی سائنس نے نسل پرستی کے ان تمام مفروضوں کو رد کر دیا ہے اور تار   سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ کوئی نسل خالص اور اصلی نہیں رہی، لیکن اس کے باوجود نسل پرستی کے یہ خیالات اب بھی یورپ کی اقوام میں اس وجہ سے مقبول ہیں کہ یہ ان کے امپیریل ازم میں مددگار ہیں۔

نسل پرستی اور استحصال

موتزم علی

نسل پرستی کا جذبہ معاشرہ میں نہ تو فطری ہے' اور نہ ہی مستقل' یہ ایک غیر فطری تخلیق ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ غیر مساوی درجہ بندی کو مستقل طور پہ قائم کیا جائے۔ قوموں کی پس ماندگی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وسائل کی تقسیم مساوی بنیادوں پر نہیں ہے۔ اس وجہ سے نسل پرستی اور پس ماندگی دونوں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے' اور ان کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ معاشرہ کے ایک طبقہ کو وسائل کی پہنچ سے دور رکھا جائے۔

نسل پرستی اور تعصب

نسل پرستی اور تعصب میں کیا رشتہ ہے؟ تعصب کو آسانی کے ساتھ اس طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ جذباتی رجحان اور رائے ہے جو کہ نفرت پر ہوتی ہے' اور یہ کسی چیز کو جانے اور سمجھے بغیر اس کے بارے میں اختیار کر لی جاتی ہے۔

لیکن نسل پرستی کی تعریف اتنی آسان نہیں اور اس کی بہت سی تعریفیں اس قدر متضاد ہیں کہ جس طرح خود نسل کی۔ لیکن عام طور پر سب اس بات پر متفق ہیں کہ نسل

دنیا کو پس ماندہ رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ تو یہ نسل پرستی کا ایک آلہ بن جاتی ہے۔

جب قوموں یا نسلی گروہوں میں دو قسم کے تعلقات ہوں تو اس صورت میں ان میں مقبول عام قسم کے تعصبات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تعصبات جہالت اور خوف کی وجہ سے ابھرتے ہیں۔ اور ان کے پس منظر میں ان کے جسمانی اور ثقافتی اختلافات بھی ہوتے ہیں۔ نسل پرستی کے رجحانات ان معاشروں میں زیادہ پیدا ہوتے ہیں کہ جو نسلی طور پر ایک ہوں جغرافیائی طور پر علیحدہ ہوں، اور سماجی طور پر رجعت پرست ہوں، اور تمام مراعات و اختیارات چند لوگوں کے ہاتھ میں ہوں۔ اس قسم کے معاشرے قومی اور نسلی اختلافات سے ڈرتے ہیں۔ اور ان کا نسلی تعصب انہیں اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ وہ خود کو پاک و صاف اور محفوظ رکھ سکیں گے اور اپنے اتحاد کو برقرار رکھ سکیں گے۔ 17 ویں اور 18 ویں صدی کا انگلستان اس کی بہترین مثال ہے کہ جس میں غیر عیسائیوں کو گمراہ سمجھا جاتا تھا اور اس لئے عیسائیوں سے کم تر۔ اسی نظریہ نے یہودیوں کو حقیر بنا دیا اور انہیں حضرت عیسیٰ کی موت کا ذمہ دار سمجھ کر ہمیشہ کے لئے ذلیل سمجھا گیا۔ اس طرح مغربی کلچر میں یہ روایت تھی کہ کسی جماعت اور گروپ کو ان کی نسل اور کلچر کی بنیاد پر برا سمجھا جائے اور ان کے مقابلہ میں عیسائی کلچر کو برتر مانا جائے۔

کالا اور سفید

عیسائی کلچر میں کالے اور سفید کے درمیان تعصبات بہت قدیم ہیں۔ اس سے بھی پہلے کہ ان کا تعلق کالی نسل کے لوگوں سے ہوا۔ کالے کو ہمیشہ سے گناہ اور برائی کی علامت سمجھا گیا۔ اور اس سے موت اور جہنم کو منسوب کیا گیا۔ اس قسم کے جملے اور الفاظ جیسے بلیک لسٹ، کالی بھیڑ، کالا جادو، برائی کے معنوں میں آج بھی استعمال ہوتے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں سفید معصومیت، پاکیزگی اور امن کا رنگ بن گیا۔ اس لئے جب یورپ اور افریقہ کے درمیان تصادم ہوا تو پہلے سے موجود تعصبات امپیریل ازم، اور کولونیل ازم کے پھیلانے میں کام آئے۔

پھیلاؤ

یہ ہندوستان، چین، شمالی افریقہ اور بعد میں یونان اور روم کی تہذیبیں تھیں کہ جنہوں نے تحریر شناسی، اور حساب میں سائنسی طور پر ایجادات کیں اور ان کی بنیاد پر یورپ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی مختلف عہدوں میں ترقی ہوئی۔ اور وہ اس قابل ہوا کہ اس نے دنیا کے کئی حصوں میں اپنی نوآبادیات قائم کیں۔ یہاں تک کہ ان کی طاقت اس قدر بڑھ گئی کہ انہوں نے سوچا کہ یہ یورپی لوگ ہیں کہ جنہوں نے سائنس کی ابتداء کی ہے۔ یورپ کی ترقی کی بنیادیں ان کے سمندر کے بارے میں معلومات، دھماکہ خیز مادہ کی دریافت اور چھپائی، ور کاغذ بنانے کے کارخانے تھے جو کہ دنیا کی دریافت اور اقتدار میں ان کے معاون ہوئے۔

نوآبادیات کیوں؟

11 سے 13 ویں صدی تک یورپ میں جاگیرداری کی طاقت چرچ اور امراء کی وجہ سے تھی۔ اس دور میں جنگلات کاٹ کر زمین ہموار کی گئی اور زراعت کو بہتر بنایا گیا۔ جب آبادی بڑھنا شروع ہوئی تو اس کے ساتھ تاجروں کا طبقہ ابھرا کہ جس کا تعلق زمین سے نہیں تھا۔ یہ تجارت کی خاطر یورپ اور ایشیا کے ملکوں میں گئے۔ جب اون اور گندم کی صنعت نے ترقی کی تو اس کے منافع سے کسان تمام معاشرہ کے کفیل بن گئے چرچ اور امراء کی طاقت بڑھ گئی۔ اور انہوں نے زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگانا شروع کر دیئے تاکہ انہیں اپنی عیاشیوں اور نجی فوج کی دیکھ بھال کے لئے استعمال کر سکیں۔ ان کے جبر کی وجہ سے کسانوں کی بغاوتیں عام ہو گئیں۔ جس کی وجہ سے کسان اور جاگیردار

کے تعلقات بگڑ گئے اور اس کا اثر زراعت و کاشت پر ہوا۔ غربت، بھوک، اور بے چارگی ہر طرف چھا گئی۔ ان حالات کا کچھ تو نتیجہ نکلنا تھا۔

تجارت

تجارتی راستوں کی دریافت اور تجارت نے یورپ کے لئے دولت کے دروازے کھول دیئے۔ اور مشرق سے تجارتی تعلقات قائم کر لئے گئے۔ چونکہ بری راستے لمبے اور خطرناک تھے۔ اس لئے کوشش کی گئی کہ سمندری راستوں کو تلاش کیا جائے۔ اسی کوشش کے نتیجے میں پرتگیزیوں اور ہسپانیوں نے سمندری راستوں کو دریافت کر کے امریکہ اور افریقہ کے بہت سے نامعلوم ملکوں کو تلاش کیا۔ پرتگیزی جنوب کی طرف گئے اور افریقہ ہوتے ہوئے ہندوستان تک پہنچے اور جہاں جہاں گئے وہاں تجارت کرتے گئے۔ ہسپانوی مغرب کی طرف گئے اور انہوں نے امریکہ میں دولت کے انبار پائے۔ انہوں نے صرف سونا اور چاندی لوٹنے کے علاوہ وہاں کے لوگوں کو بھی تباہ و برباد کیا اور میکسیکو کی ترقی یافتہ ایزٹک اور پیرو کی انکا تہذیبیں مٹا دی گئیں۔ ہسپانیوں کی یہ دلیل تھی کہ یہ لوگ وحشی اور جاہل ہیں اور انہیں مہذب بنانے کی ضرورت ہے۔ حالانکہ ان کی زراعتی ترقی اس وقت کے یورپ سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔

ہتھیار اور بیماریاں

امریکہ کے قدیم باشندوں کے پاس جدید ہتھیار نہیں تھے۔ اس لئے وہ یورپی بندوقوں کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ ہسپانوی اپنے ساتھ بہت سی بیماریاں لائے جو کہ امریکیوں کے لئے نئی تھیں۔ جن میں چیچک، خسرہ اور بخار قابل ذکر ہیں۔ ان میں ان بیماریوں سے مزاحمت کرنے کی قوت نہیں تھی۔ درحقیقت بیماریوں کے جراثیم کو استعمال کر کے سترہویں صدی میں، مقامی باشندوں کا قتل عام کیا گیا تاکہ اس ذریعہ ان کی آبادی کو گھٹا کر ان کی زمینوں پر قبضہ کیا جائے۔ لیکن ان ہتھیاروں اور بیماریوں کے

باوجود مقامی امریکیوں نے یورپیوں کا سخت مقابلہ کیا۔ پرتگیزیوں اور ہسپانیوں نے اس بات کی بڑی کوشش کی کہ انہیں کانوں میں بطور غلام کے استعمال کریں، لیکن اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ کانوں میں کام کی سختی اور ماحول کی خرابی سے اکثر مر گئے اور جو زندہ رہے انہوں نے مزید کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس وجہ سے یورپیوں نے سستے مزدوروں کی تلاش کے لئے دوسرے ذرائع کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔۔۔ اور یہ تھے افریقہ سے لائے گئے غلام۔

سرمایہ داری اور چرچ

سترہویں صدی میں فرانس، ہالینڈ اور برطانیہ پرتگیزیوں کے ساتھ مقابلہ میں آ گئے کیونکہ ان ملکوں میں تاجروں کا طبقہ پیدا ہو چکا تھا جو دوسروں کی محنت کو اپنے نفع کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ نوآبادیات میں جو یورپیوں نے استحصال کیا اور آج تیسری دنیا جس سے دوچار ہے وہ اس عمل کا سلسلہ ہے جو اس طبقہ نے ابتداء میں اپنے ملکوں میں شروع کیا تھا۔ ان کا سب سے بڑا مقصد منافع تھا۔ چونکہ غلاموں کی تجارت میں بڑا پیسہ تھا لہٰذا اس کو شروع کیا گیا، اور اس کا جواز بعد میں ڈھونڈا گیا۔

جب تجارتی مقابلہ میں بے رحمی کا عنصر داخل ہوا تو چرچ نے خود کو عجیب صورت حال سے دوچار پایا کیونکہ تاجروں کی سرگرمیاں چرچ کی تعلیمات اور عیسائی اخلاقیات کے برعکس تھیں۔ لیکن یہ بھی ضروری تھا کہ چرچ اور تجارتی مفادات ایک رہیں کیونکہ دونوں ہی معاشرہ کے طاقت ور ادارے تھے۔ تحریک اصلاح مذہب اور پروٹسٹنٹ فرقہ کا عروج دونوں ہی اہم واقعات تھے۔ اس کے نتیجہ میں دو نظریات ابھرے، اول یہ کہ اگرچہ بادشاہ کی ذات کے لئے محنت کرنی چاہئیے اور اس کی خدمت بجا لانی چاہئیے۔ لیکن ساتھ ہی میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ وقت تجارت اور دوسرے دنیاوی کاموں پر بھی دینا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ روحانی اور تجارتی معاملات سرکاری طور پر علیحدہ علیحدہ

کر دیئے گئے۔ اب تجارت اور دنیاوی معاملات میں چرچ کا کوئی دخل نہیں رہا۔

دوسری طرف جب افریقہ میں نوآبادیات کا قیام ہوا تو یورپیوں کو روحانی طور پر ان سے برتر تسلیم کیا گیا تاکہ وہ اس بنیاد پر وہاں اپنا اقتدار قائم کر سکیں۔ اس صورت حال کے پیدا ہونے کے بعد تاجر طبقہ تمام مذہبی پابندیوں سے آزاد ہو گیا اور اس نے اپنی تجارتی سرگرمیوں کو پھیلا دیا۔ اور بڑی تعداد میں خام مواد کو نوآبادیات سے لا کر اسے صنعت میں استعمال کیا گیا۔ یورپ کی صنعتی ترقی میں جہاں خام مواد نے حصہ لیا۔ وہاں خصوصیت سے ویسٹ انڈیز کی شکر قابل ذکر ہے۔

شکر اور غلامی

ویسٹ انڈیز کو ابتداء میں بری طرح لوٹا گیا۔ اور جب وہاں سے کوئی چیز لے جانے کے قابل نہیں رہی تو پھر اس کی زمین کو کاشت کے لئے استعمال کیا گیا، تاکہ اس طرح جو بھی پیداوار ہو سے لوٹا جائے۔ یورپ میں اس وقت طبقہ امراء کے لئے عیاشی کی چیزوں کی بڑی مانگ تھی اس لئے ابتداء میں یہاں پر وسیع پیمانے پر تمباکو کی کاشت کی گئی لیکن جلد ہی یہ احساس ہوا کہ شکر کی بھی بہت زیادہ مانگ ہے۔ کیونکہ اسی وقت چائے، کافی اور کوکو پینے کا رواج ہوا تھا اور ان کا اصل ذائقہ کڑوا تھا جسے شکر کے ذریعہ خوش ذائقہ بنایا جا سکتا تھا چنانچہ 17 ویں صدی میں گنے کے کھیتوں کو سرمایہ دارانہ خطوط پر منظم کیا گیا اور کھیتوں پر ہی گنے کے رس کو صاف کر کے برطانیہ بھیجا جاتا تھا۔ گنے کے کھیتوں کے شروع ہوتے ہی غلاموں کی تجارت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔

جب ابتداء میں یورپی افریقہ گئے تو انہوں نے وہاں پر متمدن معاشروں کو دیکھا جن کی اپنی صنعتیں تھیں، تجارتی رابطے تھے، بڑے بڑے شہر تھے۔ غلاموں کی تجارت کا مطلب تھا کہ وہاں سے مسلسل نوجوان لوگوں کو پکڑ کر لایا جائے۔ اس کا اثر ان کے معاشروں پر تباہ کن ہوا۔ ایک بار جب اس عمل سے افریقہ کمزور ہو گیا تو یورپی اقوام کو

افریقہ کو قبضہ میں لانے اور وہاں اپنا اقتدار قائم کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

یورپ کی تطہیر

غلام صرف افریقہ ہی سے نہیں لائے گئے تھے بلکہ یہ یورپی ممالک کے بھی تھے۔ مفلس اور قیدیوں کو بطور مزدور زبردستی بھیجا گیا۔ اس طرح سے برطانیہ نے اپنے معاشرہ سے جو بھی ناپسندیدہ افراد اور مجرم تھے انہیں نکال دیا۔ اس کے علاوہ وہ آبادی جو کہ "ضرورت سے زیادہ" ہو گئی تھی وہ ان نوآبادیات میں تلاش روزگار اور مواقع کی تلاش میں گئی۔ آسٹریلیا میں آباد کاروں کی اکثریت مجرموں پر مشتمل تھی۔ لیکن بات یہ تھی کہ سفید فام مجرم اور غریب مزدور بھی چند حقوق رکھتے تھے کہ جس سے کالے افریقی بالکل محروم تھے۔ پانچ یا دس سال کی مزدوری کے بعد یہ آزاد ہو جاتے تھے اور انہیں یہ حق مل جاتا تھا کہ زمین کے ایک ٹکڑے پر کاشت کر سکیں۔ لیکن جب زمین کی کمی محسوس ہونا شروع ہوئی تو سفید مزدوروں کو ایک بوجھ سمجھا جانے لگا۔ اس لئے افریقی غلاموں کی افادیت بڑھ گئی۔ اور انہیں نسل پرستی کی بنیادوں پر اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا گیا۔

مزاحمت

کھیتوں پر غلام ہر طرح کی اذیت اور سزا کو برداشت کرتے تھے۔ جن میں مارنا، پھانسی دینا، جلانا، اور اذیت دینا سب ہی شامل تھیں۔ لیکن اس کے باوجود مزاحمت شدید تھی۔ بہت سے غلاموں نے بغاوتیں کیں اور فرار ہونے کی کوششیں کیں۔ اور فرار ہو کر دور دراز کے علاقوں اور پہاڑوں میں اپنی بستیاں آباد کیں۔ کیونکہ انہیں افریقہ میں مختلف جگہوں سے پکڑ کر لایا جاتا تھا۔ اس لئے ان کی کوئی ایک زبان نہیں تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زبانوں کی بنیاد پر ایک زبان تخلیق کی۔ اور اس میں بہت سے الفاظ یورپی زبانوں کے بھی تھے، موجودہ ویسٹ انڈیز کی سیرول (CROLE) زبان کی ابتداء

اسی طرح سے ہوئی اور اس زبان کے ذریعہ انہوں نے مزاحمت کو آگے بڑھایا کیونکہ یہ وہ زبان تھی کہ جو ان کے مالک نہیں سمجھتے تھے۔

صنعتی انقلاب

شکر سے جو منافع کمایا گیا وہ بہت زیادہ تھا۔ اور اس منافع کا بیشتر حصہ پہلے سے طاقتور متوسط طبقہ کو ملا۔ اس لئے برطانوی معاشرہ میں موجود مزدوروں کی بہتات، منافع کی موجودگی، اور تیار شدہ اشیاء کے لئے موجود منڈیوں نے وہ صورت حال پیدا کر دی کہ جس کی وجہ سے صنعتی انقلاب کی راہیں ہموار ہو گئیں۔ برطانیہ پہلا ملک تھا کہ جہاں فیکٹریاں قائم ہوئیں۔ اور اس وجہ سے 50 سال تک اس نے اپنی اجارہ داری کو قائم رکھا۔ لیکن اس انقلاب کی بنیاد غلامی تھی۔ یہ غلامی ہی تھی کہ جس کی وجہ سے دنیا کے نقشہ پر برسٹل اور لیورپول صنعتی شہر بن کر ابھرے۔ جب لیورپول میں دولت آنی شروع ہوئی تو لنکا شائر میں کپڑے کے مل قائم ہونا شروع ہوئے اور یہیں سے صنعتی انقلاب کی ابتداء ہوئی۔ کپڑے کی صنعت کے ساتھ ساتھ، صنعتی طور پر بھاپ کا استعمال شروع ہوا اور پھر فولاد کی صنعت ابھری اور اس نے ریلوے کو جنم دیا۔ صنعت کے نتیجہ میں بنک اور انشورنس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اب یہ اس بات کے لئے تیار تھے کہ نئی صنعتوں میں سرمایہ کاری کریں اور ان میں پیسہ لگائیں۔

آزادی

جب صنعتی ترقی اور سرمایہ داری کی شکل بدلی، تو اس کے نتیجہ میں غلامی کے ادارے کی مخالفت پیدا ہوئی۔ غلامی کے ادارے کی مخالفت اس وجہ سے ہوئی کہ غلاموں سے کام کی وجہ سے منافع کی شرح گھٹنے لگی تھی۔ غلامی کے خاتمہ تک ویسٹ انڈیز میں ان کی اکتالیس بغاوتیں ہوئی تھیں۔ چنانچہ اس بات کا احساس بڑھتا گیا کہ غلاموں سے مزید کام کرانا زیادہ منافع بخش نہیں۔ اگرچہ غلاموں کے خاتمہ کو انسانیت کی بڑی فتح کہا جاتا

ہے مگر اس کے معاشی پہلو کو عام طور پر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ مشینوں کی ایجاد اور وقت نے اس ادارے کو معاشرہ کے لئے بوجھ بنا دیا تھا اس لئے اس سے چھٹکارا پانا سرمایہ دار کے مفاد میں تھا۔

نسل پرستی کی ضرورت

غلامی کو 1833 ء میں ختم کر دیا گیا۔ لیکن یورپ کی صنعت اور ان کی برتری کی بنیاد یہی ادارہ تھا۔ اور اب اس کے خاتمہ کے بعد بھی ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ کالے لوگوں کے استحصال کو جاری رکھیں۔ یورپ میں بہت پہلے سے کالے کو سفید کے مقابلہ میں کم تر سمجھا ہی جاتا تھا۔ لہٰذا اب سفید سرمایہ دار کو صرف اس بات کی ضرورت تھی کہ ان تمام تعصبات کو جو پہلے سے موجود ہیں کس طرح سے آپس میں ملایا جائے۔ اور اسے ایک باقاعدہ نظریہ کی صورت میں ڈھالا جائے، چنانچہ اگر غلامی باقی نہ رہے تو اس نظریہ کی مدد سے استحصال کا عمل جاری رہے۔

اس نظریہ کے تحت کچھ کا تو یہ کہنا تھا کہ کالے انسان ہی نہیں ہیں اور دوسرے ان کو انسان تسلیم کرتے تھے مگر کم تر۔ اور اس لئے ان کو غلام بنایا جا سکتا تھا، اور یورپی اقوام کے غلام بن کر یہ اپنی زندگی بہتر بنا سکتے تھے۔ غلامی کے جواز میں 1788 ء میں ولیم کوپر نے جو نظم لکھی وہ اس ذہنیت کی عکاسی کرتی ہے۔

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں غلاموں کی خریداری پر اداس ہو جاتا ہوں
اور مجھے معلوم ہے کہ جو انہیں خریدتے اور فروخت کرتے ہیں
وہ بدمعاش ہیں
اور جو کچھ میں ان کی سختیوں، اذیتوں، اور تکلیفوں کے بارے میں سنتا ہوں۔
تو اس سے ایک پتھر سے بھی رحم و تاسف کے جذبات پھوٹ پڑتے ہیں
مجھے ان پر رحم آتا ہے، مگر میں خاموش ہو جاتا ہوں

کیونکہ ہم آخر کس طرح بغیر ظلم اور رحم کے گزارا کریں گے

نسل پرستی کا نظریہ دفاعی ضرورت کے تحت ابھرا اور یہ دلیل دی جانے لگی کہ افریقی کم تر ہیں اس لئے کہ وہ غلام ہیں۔

جعلی سائنس

انیسویں صدی میں ادیبوں، مفکروں اور سائنس دانوں کے ایک طبقہ نے نسل پرستی کے بارے میں نئے نئے نظریات کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اس کو فرض کرتے ہوئے کہ وہ برتر ہیں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ سفید اقوام کی برتری کالی اقوام پر ضروری ہے۔ فکر اور عقل پرستی پر سفید نسل کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ چرچ کی جگہ سائنس نے لے لی۔ اور اسے بالکل صحیح اور ناقابل تردید سمجھا جانے لگا، اور اس لئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ سائنسی بنیادوں پر نسل پرستی کو جائز قرار دیا جائے۔

کھوپڑیاں

چنانچہ نسل پرستی کے نظریہ کو فروغ دینے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ سفید اقوام ذہنی، جسمانی طور پر برتر و افضل ہیں۔ اس زمانہ میں کھوپڑیوں کو جمع کرنے کا شوق ہوا اور اس سلسلہ میں ہر نسل کے لوگوں کی کھوپڑیاں دنیا بھر سے جمع کی جانے لگیں۔ اور ان کے سائز کو دیکھ کر کسی نسل کی ثقافتی اہمیت کو ثابت کیا جانے لگا۔ ایک یورپی کھوپڑی کے تجزیہ کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ اس کا وزن سائنس اور اعلیٰ خیالات کے لئے موزوں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کھوپڑی کی شکل پر اس قدر زور کیوں دیا گیا؟ اس کا جواب ہم خود دے سکتے ہیں، اگر کھوپڑی کی بجائے سر پر بالوں کی تعداد سے تہذیب و ثقافت کا اندازہ لگایا جاتا، تو اس صورت میں کالی اقوام سب سے اعلا قرار پاتیں۔ اور سفید اقوام کو بالکل نچلے درجہ پر بندروں کے ساتھ جگہ ملتی۔ نسل پرستوں نے ڈاردن کے نظریہ "طاقت ور کی بقاء" کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا اور ثابت کیا کہ

صرف سفید اقوام ہی دنیا کے فطری حکمراں ہیں۔ اور نمایاں خصوصیات ان کی ہڈیوں کی بناوٹ میں ہے۔ یورپی ارتقاء کے عمل میں دوسری قوموں سے آگے ہیں اور جب دوسری چھوٹی اقوام تباہ ہو جائیں گی تو صرف سفید اقوام اس جدوجہد میں باقی بچیں گی۔ اس نظریہ کی وجہ سے کم تر درجہ کی اقوام کا قتل عام جائز ہو جاتا ہے۔ اس لئے سفید اقوام نے تہذیب کے نام پر ریڈ انڈین اور آسٹریلیا کے مقامی باشندوں کا قتل عام کیا۔ کیونکہ بحیثیت کم تر نسل کے انہیں نیست و نابود تو ہونا ہی تھا، لہٰذا کیوں نہ اس عمل کو تیز تر کیا جائے اور سفید اقوام کے لئے جگہ پیدا کی جائے۔

ڈاکٹر رابرٹ فاکس نے اپنی کتاب "انسان کی نسلیں" میں جو 1850ء میں چھپی بیسویں صدی میں فاشزم کے لئے راہ ہموار کی۔ اس کا کہنا تھا کہ

"کس کو پروہ ہے ایک سیاہ فام کی، ہوٹن ٹوٹ کی، یا کافر کی؟ یہ مسائل پیدا کرنے والی نسلیں ہیں۔ اور ان کو جتنی جلدی راستے سے ہٹا دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

یا "سیاہ فام اقوام جانوروں کی طرح اپنے وجود کو ایک چھوٹے سے دائرہ میں محدود رکھتی ہیں۔ اس لئے اگر انہیں تباہ کر دیا جائے تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔"

علم بشریات

علم بشریات، جو معاشروں اور لوگوں کے بارے میں ہے، اس کی ابتداء کھوپڑیوں کے مطالعہ سے شروع ہوئی۔ اس لحاظ سے اس علم کی بنیاد نسل پرستی پر ہے۔ ابتداء میں یہ ثابت کیا گیا کہ یہ "سفید آدمی کا بوجھ" ہے کہ نوآبادیات کے لوگوں کا تحفظ کریں اور انہیں مہذب بنائیں۔ اس وقت کی اسکول کی کتابوں میں کالے آدمی کو ظالم اور وحشی بتایا جاتا تھا جس کو پڑھ کر سفید بچوں میں جوش پیدا ہو تاکہ وہ انہیں مہذب بنائیں۔

ان باتوں نے نسل پرستی کو قابل احترام بنا دیا۔ اور یہ خیال مقبول عام ہو گیا کہ کالی اقوام غیر مہذب ہیں۔ حالانکہ اس کے برعکس ابتدائی یورپی سیاحوں نے ان اقوام

کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مہذب اور متمدن معاشرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن جب نسل پرستی کو ضرورت پڑی تو انہوں نے کالے لوگوں کو غلام بنانے کے جواز تلاش کر لئے۔ کالے بیوقوف ہیں مگر جسمانی طور پر طاقت ور، اس لئے ان سے سخت مشقت کے کام لینے چاہئیں۔ وہ اس طرح سے تکلیف اور اذیت محسوس نہیں کرتے جیسے کہ سفید لوگ۔ چونکہ وہ سست اور چالاک ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ان کے کام کی نگرانی کی جائے۔ نسل پرستی کے اس نظریہ میں تضادات کی بھرمار ہے، مگر ہر ایسا نظریہ جو مختلف مفادات کے تحت پیدا ہوتا ہے انہیں تضادات کا شکار ہوتا ہے۔

ہندوستان

ہندوستان میں انگریزوں کی سترہویں صدی میں آمد ہوئی۔ اس کے بعد سے انہوں نے آہستہ آہستہ یہاں پر اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط کرنی شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ اس پر قابض ہو کر حکمران بن گئے۔ سترہویں صدی میں ہندوستان ایک امیر اور خوش حال ملک تھا اور معاشی طور پر بہت سے یورپی ملکوں سے ترقی یافتہ تھا۔ انگریز تاجروں نے اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں پر اپنے دوست بنائے تاکہ ان کی مدد سے سیاسی اقتدار حاصل کر سکیں۔ جب انگریزی اقتدار قائم ہو گیا تو ہندوستان کے طبقہ اعلیٰ نے نہ صرف اسے تسلیم کر لیا بلکہ انگریزی کلچر کی بہت سی باتوں کو اختیار کر کے وہ ان کے قریب ہو گئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی

ایسٹ انڈیا کمپنی کو انگلستان کے تاجروں نے سترہویں صدی میں قائم کیا، اور انیسویں صدی تک انہوں نے تقریباً تمام ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستان کی فتح ان کے لئے بہت سود مند ثابت ہوئی۔ انگریزوں نے ہندوستان میں نہ تو اپنی "زیادہ آبادی" کو بھیجا اور نہ یہاں پر "سفید اقلیت" کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔

بلکہ اسے انہوں نے ایک ایسی نو آبادیات کی شکل دی کہ جو برطانوی صنعت کے لئے خام مواد پیدا کرے۔

برطانیہ نے ہندوستان میں سب سے پہلے بنگال پر قبضہ کیا، اور اس کے نتیجے میں اس کی خوش حالی اور زرخیزی بہت تھوڑے عرصہ میں ختم ہو گئی۔ اور جب قحط آیا تو 10 ملین آدمی بھوک سے مر گئے۔ لیکن قحط کے باوجود کمپنی ٹیکس وصول کرنے اور جمع کرنے میں مصروف رہی۔ کمپنی نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ کس طرح سے ہندوستان کی کپڑے کی صنعت کو تباہ کیا جائے کیونکہ یہ ابھرتی ہوئی برطانوی کپڑے کی صنعت کے لئے ایک رکاوٹ تھی، لہذا تیار کپڑے کے بجائے ہندوستان سے خام روئی برطانیہ بھیجی جانے لگی اور وہاں سے تیار شدہ کپڑا مہنگے داموں ہندوستان میں فروخت ہونے لگا۔ اس کی وجہ سے ہندوستان کے شہر اور صنعتی مراکز تباہ ہو گئے۔

جب ویسٹ انڈیز میں غلامی کا خاتمہ ہوا۔ تو بہت سے غلاموں کے تاجر وہاں سے ہندوستان چلے آئے اور یہاں انہوں نے چائے، کافی اور ربڑ کے کھیت لگائے۔ چونکہ زراعتی پیداوار پر انگریزوں کا اختیار تھا۔ اس لئے اناج کو برآمد کیا جاتا تھا، جب کہ ہندوستانی فاقہ سے مرتے تھے۔ انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں تقریباً 20 ملین بھوک سے مر گئے۔ ہندوستان میں سڑکوں اور ریلوے کی تعمیر اس لئے کی گئی تاکہ ہندوستان کے مال کو تیزی سے باہر لے جایا جائے۔

نسل پرستی کا فروغ

اٹھارویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے بارے میں اسی قسم کا نسل پرستی کا رجحان پیدا ہوا جیسا کہ ویسٹ انڈیز کے بارے میں تھا۔ ابتداء میں انگریز سیاحوں نے ہندوستانی تہذیب و تمدن کی تعریف کرتے ہوئے ہندوستانیوں کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ لیکن اب ان کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ اہل برطانیہ اس بات پر یقین کرتے تھے کہ انہیں

دنیا میں حکومت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور ہندوستان کی فتح کے بعد تو ان کے اس یقین میں مزید استحکام آ گیا۔ سفید برتری کے نظریات تخلیق ہوئے اور انہیں کتابوں، اخباروں، اسکولوں، قانون اور زبان کے ذریعہ لوگوں میں مقبول بنایا گیا۔

جہاں کہیں بھی نوآبادیاتی نظام قائم ہوا۔ وہاں عیسائی مشنری بھی گئے تاکہ گمراہ لوگوں کو عیسائی بنا کر ان کی نجات کا بندوبست کیا جائے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مقامی لوگ اپنی عادات و اطوار تبدیل کر کے یورپی ثقافت کو اختیار کریں۔ مقامی لوگوں کے بچوں کو مشن کے اسکولوں میں اپنی مادری زبان بولنے کی اجازت نہیں تھی۔

نسل پرستی کے نظریات کے تحت یہ بھی ضروری تھا کہ دوسری تہذیبوں کے کارناموں کو نظرانداز کیا جائے۔ چنانچہ آج کے ایک جدید مورخ ٹریور روپر کا یہ کہنا ہے کہ "نوآبادیات سے پہلے افریقہ کی کوئی تاریخ نہیں تھی" وہ عظیم تہذیبیں کہ جنہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا جیسے کہ مصر کی تہذیب، تو انہیں افریقہ کے بجائے یورپ سے قریب تر بتایا گیا۔ انیسویں صدی میں سفید فام مہم جوؤں نے پندرہویں صدی کے آثار دریافت کئے جو کہ زمبابوے سے لے کر موزمبیق تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر انہوں نے اس سے انکار کر دیا کہ یہ سیاہ فام لوگوں کی تہذیب ہو سکتی ہے، اور اس قسم کے نظریات تراشے جا رہے ہیں کہ انہیں کسی طرح سے سفید اقوام کے کارناموں میں شامل کر دیا جائے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس قسم کی تاریخ کو آج تک اسکولوں میں پڑھایا جا رہا ہے۔ اس لئے اس سے اس بات کی نفی ہوتی ہے کہ نسل پرستی کے جذبات ختم ہو گئے ہیں۔ بلکہ آج بھی اسی طرح سے زندہ ہیں اور تیسری دنیا کے استحصال میں انہیں استعمال کیا جا رہا ہے۔

آزادی کے بعد

دوسری جنگ عظیم کے بعد نوآبادیات کی آزادی ان ملکوں میں کوئی بنیادی تبدیلی

لے کر نہیں آئی۔ اگرچہ یہ ممالک آزاد ہو چکے تھے، لیکن معاشی و سیاسی طور پر مغربی ممالک کی گرفت میں تھے جو ان کے وسائل سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ تیسری دنیا کے ممالک کے درمیان آپس میں سڑکوں یا ریلوے کے ذریعہ رابطہ بہت کم ہے۔ اس لئے وہ مجبور ہیں کہ مغرب سے تجارت کریں۔ نوآبادیات کے دور میں فصلوں کی کاشت اس طرح سے کی گئی کہ یہ ممالک غذا میں کبھی خود کفیل نہ ہو سکیں مثلاً اگر ایک ملک بہت کافی پیدا کرتا ہے۔ تو اسے دوسری غذائی ضروریات کے لئے دوسروں پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ بڑی بڑی کمپنیاں اپنے مفادات کے تحت قیمتوں کا تعین کرتی ہیں اور یہ ممالک ان کی قیمتوں پر اپنی پیداوار فروخت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

برطانیہ نے اپنی نوآبادیات کو آزاد کرنے سے پہلے، یہاں پر مقامی افسر شاہی کو برطانوی طرز پر تربیت دے کر اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ ان کے جانے کے بعد بھی، انہیں کی طرح، انتظام کو چلائیں اور ان کے مفادات کا تحفظ کریں۔ اس وقت بھی تیسری دنیا کا حکمران طبقہ مغرب میں اعلیٰ تربیت پاتا ہے۔ جہاں وہ مغربی تعلیم اور ثقافت کے دلدادہ ہو جاتے ہیں اور جب وہ اپنے وطن واپس آتے ہیں تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ مغربی ثقافت کی ترقی کا کام کریں اور جب بھی ان راہنماؤں کو اپنے ملکوں میں سیاسی مخالفت یا بغاوت کا سامنا ہوتا ہے تو اس وقت مغرب ان کی حمایت کرتا ہے۔ اذیتوں کے آلوں سے لے کر جدید فوجی ہتھیار ان کو مغربی ملکوں سے ملتے ہیں تاکہ وہ اپنے آمرانہ طرز حکومت کو مضبوط کر سکیں۔

نوآبادیات کے ابتدائی دور میں، روایتی طریقہ زندگی پر ضرب لگا کر اسے تباہ کیا گیا تھا، اور آزادی کے بعد بھی یہ عمل اب بھی جاری ہے۔ تیسری دنیا میں مغربی ٹیکنالوجی اور میڈیسن مکمل طور پر درآمد کی جا رہی ہے۔ جو کہ ان کی عادات و اطوار اور آب و ہوا کے خلاف ہے۔ روایتی اور قدیم طریق علاج کو توہم پرستی کا نام دے کر اسے متروک کر دیا گیا، حالانکہ اس طریقہ علاج سے صدیوں مقامی لوگ بیماریوں کا علاج کرتے رہے

اسی طرح کاشت کاری کے طریقے جو ایک عرصہ سے عمدہ نتائج پیدا کر رہے تھے، انہیں فرسودہ کہہ کر چھوڑ دیا گیا۔ اور ان کی جگہ مہنگی مشینیں اور جراثیم کش دوائیں متعارف کرائی گئیں جنہوں نے ماحول کو خراب کرنے میں حصہ لیا۔

اس صورت حال کے پیش نظر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ نسل پرستی اور استحصال لازم و ملزوم ہیں، اور دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اور آج بھی تیسری دنیا کے ملکوں کو ان سے مقابلہ ہے۔

آسٹریلیا کے مقامی باشندے

روبن ہولڈر

1778 میں انگریز نسل پرستی کا اتنا بوجھ اپنے ساتھ لائے کہ وہ آسٹریلیا کے برِ اعظم کو ڈبونے کے قابل تھا اور یہ بوجھ لانے والے کون تھے؟ وہ ایک ہزار سفید فام کہ جن میں دو تہائی برطانوی معاشرے کے پست ترین لوگ تھے اور جن کے لئے برطانیہ میں زندگی مفلسی، گندگی اور وحشیانہ پن کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی۔

آسٹریلیا کے مقامی باشندوں کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہاں سفید فام لوگوں کے ساتھ کسی بھی طرح رہ سکیں۔ شکاری طریقہ زندگی اور کاشتکاری میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اہلِ برطانیہ مقامی لوگوں کے رسم و رواج اور عادات سے قطعی بے خبر تھے، اور ان میں مشترکہ زندگی گزارنے کا جو طریقہ تھا، وہ ان کے لئے اجنبی تھا۔ اور چونکہ ان آنے والوں میں تمام مرد تھے اس لئے انہوں نے مقامی عورتوں کو اغواء کرنا، غلام بنانا، اور ان کی عزت لوٹنا شروع کر دی۔

بغیر اعلان کے جنگ

جیسے جیسے کالونی کا دائرہ بڑھتا گیا، ایسے ایسے نو آباد کار جارحانہ رویہ اختیار کرتے گئے، اور مقامی لوگوں کے خلاف انتقامی کاروائیاں تیز ہو گئیں، نو آباد کاروں کو مسلح کر کے فوج کے ساتھ مقامی لوگوں کے خلاف لڑایا گیا۔ چونکہ مقامی لوگوں کو بادشاہ کی رعایا قرار دے دیا گیا تھا، اس لئے ان کی ہر مزاحمت کو بغاوت کا نام دیا گیا، اور ایسی تمام بغاوتوں کو سختی کے ساتھ کچل دیا گیا۔ چونکہ ان مقامی لوگوں کا نہ تو حق ملکیت تسلیم کیا گیا اور نہ انہیں قوم مانا گیا۔ اس لئے ان کے خلاف رسمی طور پر نہ کوئی اعلان جنگ ہوا اور نہ ہی ان سے کسی قسم کے معاہدے کئے گئے۔

ہالی وڈ نے اپنی فلموں کی ذریعہ امریکہ کے مقامی باشندوں اور سفید فام لوگوں کے درمیان جنگوں کی فلم بنا کر ان کی مزاحمت کو ظاہر کر دیا ہے، لیکن آسٹریلیا کے مقامی لوگوں کی مزاحمت اور جنگوں کے واقعات گہری تہوں میں چھپے ہوئے ہیں، کیونکہ یہ فاتح ہوتے ہیں جو کہ تاریخ لکھتے ہیں۔ ایک سو پچاس سال کی طویل جنگ میں، آسٹریلیا کے مقامی باشندوں کی 80 فیصد آبادی قتل ہو گئی، لیکن اس کے باوجود پر امن آباد کاری کے مفروضہ کا پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا۔

جیسے ہی خوں ریز مزاحمت ختم ہوئی، بے گھر مقامی باشندوں کو محض ایک دیہاتی گندگی سمجھ کر ان کا قتل عام کیا گیا۔ اس مرحلہ پر مشنری آئے تاکہ اس مرتی ہوئی نسل کو روحانی تسکین بہم پہنچا سکیں، حکومت نے ان کے لئے جو محفوظ علاقے متعین کئے ہیں، وہ مقامی باشندوں کے لئے اجتماعی کیمپ ہیں کہ جہاں ان کی حالت قیدیوں کی سی ہے۔ ان کیمپوں میں مقیم باشندوں کو کسی بھی آسٹریلیا کی ریاست میں کوئی حقوق نہیں۔ اس کا سفید فام مینجر ان کے لئے ایک آمر کی طرح ہے۔ وہ کسی کا بھی داخلہ بند کر سکتا ہے اسے باہر جانے سے روک سکتا ہے اور کسی کو بھی سزا کے طور پر اس سے خارج کر سکتا ہے۔ اس کا کام ہے کہ وہ یہاں شادی کرائے۔ باہر سے تمام رابطوں کی دیکھ بھال کرے، بچوں کو ان کے والدین سے جدا رکھے، مزدوروں کو مقررہ اجرت پر کام کی اجازت دے۔

اس طرح وہ ان کی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہوتا ہے۔ حفاظت کی یہ جگہیں سفید فام زمین کے مالکوں کو سستی مزدوری فراہم کرتی ہیں اور ان کی عورتوں کے ساتھ جنسی تعلقات کی کوئی سزا نہیں ہوتی۔ ویلفیئر بورڈ جو ان حفاظت کی جگہوں کی دیکھ بھال کرتا ہے، جب چاہے انہیں بند کر کے یہ زمین کاشت کے لئے دے سکتا ہے۔

1950 ء کی دھائی میں حکومت نے ایک نئی پالیسی وضع کی کہ جس کے ذریعہ مقامی لوگوں کو اپنے میں ضم کیا جائے، مقامی لوگوں کے نقطہ نظر سے یہ ایک دوسرا قتل عام تھا، کیونکہ اس کا مطلب تھا کہ مقامی باشندے سفید فام معاشرے میں اس طرح سے مل کر ختم ہو جائیں کہ جیسے ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا اور نہ ان کی علیحدہ سے کوئی ثقافت تھی۔ اس عمل کے تحت دوغلی نسل کے بچوں کو زبردستی ان کے والدین سے علیحدہ کر لیا جاتا تھا۔

تاریخ سے اخراج

وہ تمام علاقے کہ جن میں سفید فام باشندے آباد تھے، وہاں مقامی باشندوں کی زبان اور ثقافت کو بری طرح سے کچلا گیا۔ اور ان کی ثقافت کو آج تک نہ تو سمجھنے کی کوشش کی گئی اور نہ اس کی حفاظت کی طرف توجہ دی گئی بلکہ اسے برا بھلا کہا گیا اور حقیر سمجھا گیا۔ ماہر علم بشریات اور مورخوں نے مقامی باشندوں اور ان کے معاشرہ پر لاتعداد کتابیں لکھیں جن میں انہیں جدید عہد میں "پتھر کے زمانے والے لوگ" کہا گیا، اور ان کے خلاف نسل پرستی کے جذبات کو ہوا دی گئی۔ ایک مقامی باشندے کے مطابق "ہم انسان ہیں" اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کیا جائے"۔ آسٹریلیا کے مقامی باشندوں کی تاریخ اور نوآبادیات کے عمل کو اب تک آسٹریلیا کے اسکولوں میں نہیں پڑھایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے آسٹریلیا کی سفید فام آبادی میں مقامی باشندوں کے خلاف نسلی تعصبات کی جڑیں بڑی گہری ہیں۔ 1981 ء میں ورلڈ کونسل آف چرچ کی رپورٹ

یہ کہا گیا ہے کہ آسٹریلوی معاشرہ کے ہر پہلو میں نسل پرستی رچی ہوئی ہے۔ پریس میں مقامی باشندوں کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ شرابی اور کام چور ہیں، اور حکومت کی امداد پر زندگی گزارتے ہیں۔ اکثر دائیں بازو کی جماعتوں کا یہ خیال ہے کہ انہیں کسی جزیرہ پر جمع کر کے بم سے اڑا دیا جائے۔ اور ایسا کیا بھی گیا جب 1952ء سے 1963ء تک برطانیہ نے اپنے جوہری ہتھیاروں کو جنوبی آسٹریلیا میں ٹیسٹ کیا، اس کے نتیجہ میں تقریباً 3 سو سے 4 سو تک مقامی باشندے ہلاک ہوئے۔

مقامی باشندوں کی حالت

نسل پرستی کا اظہار آسٹریلیا میں ان حالات سے ہوتا ہے کہ جن میں سفید فام اور مقامی باشندے رہتے ہیں، سفید فام باشندوں کی صحت و صفائی کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی ہے، جب کہ مقامی باشندے غربت و گندگی میں زندگی گزارتے ہیں۔ اس وجہ سے عمر کے تناسب میں سفید اور مقامی باشندوں میں بڑا فرق ہے۔ ساٹھ فیصد مقامی باشندے دواؤں کو خریدنے کی قوت نہیں رکھتے ہیں۔ بچوں کی اموات ان میں تین گنا زیادہ ہیں۔ سڈنی کے خوبصورت شہر میں 25 فیصد مقامی بچے غذا کی کمی کا شکار ہیں، یہی کچھ صورت حال آسٹریلیا کے ہر علاقے میں ہے جہاں یا تو یہ بیماریوں میں مبتلا ہیں، یا غذا کی کمی کا شکار ہیں۔

اکثر مقامی باشندے کچے و خستہ مکانوں میں رہتے ہیں اور تمام آسٹریلیا میں بے گھر مقامی باشندے پلوں کے نیچے، باغات میں یا دریا کے کناروں پر پائے جاتے ہیں۔ بہت سے مقامی باشندے سوشل سیکورٹی کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ ان میں بیروزگاری کی شرح سفید فام لوگوں کے مقابلہ میں چھ گنا ہے۔ اگر انہیں ملازمت ملتی بھی ہے تو ان کی تنخواہ کی شرح کم ہوتی ہے۔

مقامی باشندوں اور قانونی نظام کے درمیان ہر پہلو میں تضاد ہے۔ جرائم کے قانون

کے تحت سب سے زیادہ سزائیں مقامی باشندوں کو ملتی ہیں، وہ مقابلتاً تیرہ گنا جیل میں جاتے ہیں، ان کی عورتیں جیل کی آبادی کا تیسرا حصہ ہیں۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ "مقامی باشندے مجرم ہیں کیونکہ وہ کالے ہیں۔۔۔"

مزاحمت

آسٹریلیا کے مقامی باشندوں نے اس جبر اور استحصال کے خلاف شروع سے ہی مزاحمت کی۔ ان کی حقوق کی تحریک 1971ء میں کنبرا میں اس وقت ایک علامت کے طور پر ابھری کہ جب انہوں نے دنیا کو یہ احساس دلایا کہ کس طرح سے وہ اپنے ہی ملک میں اجنبی ہو گئے۔ اس کے بعد سے مقامی لوگوں کی تنظیمیں قائم ہونا اور پھیلنا شروع ہو گئیں اور ان میں قابل ذکر لینڈ کونسلز ہیں۔ ان کا کام ہے کہ یہ زمین پر دعوؤں کو تیار کرتے ہیں۔ کانوں کی کمپنیوں سے گفت و شنید کرتے ہیں۔ اور کمیونٹی کے منصوبوں کے لئے مالی امداد حاصل کر کے ان کی تکمیل کے لئے کام کرتے ہیں۔

مقامی لوگوں کی لینڈ رائٹس کی تحریک کا کام ہے کہ ان کے زمینوں پر جو حقوق ہیں ان کے حصول کے لئے جدوجہد کی جائے۔ در مقامی لوگوں کی سیاسی اور معاشی آزادی کے لئے لڑا جائے۔

جنوبی افریقہ اور نسل پرستی

ایلن انٹرہالٹر

اپارتھائڈ (نسل پرستی) ریاست کی جانب سے تشکیل دی ہوئی اس پولیسی کا نام ہے کہ جس کے تحت سفید نسل کے اقتدار کو قائم رکھا جائے اور اس کے لئے معاشی مفادات کو حاصل کیا جائے۔ جنوبی افریقہ میں جہاں کہ سفید فام اقلیت نے اپنے سیاسی اقتدار اور معاشی استحصال کے لئے اسے اختیار کیا ہے، اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سیاہ فام اکثریت کو کچل کر رکھا جائے، ان کی معاشی ترقی کو اس قدر روکا جائے کہ وہ ان کی شرائط پر کم مزدوری پر معدنیات کی کانوں، کھیتوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ ان کی زمینوں پر قبضہ کرنے کی غرض سے وقتاً فوقتاً انہیں دھکیلنے کی پولیسی پر عمل ہوتا رہا اور انہیں محفوظ علاقوں میں منتقل کیا جاتا رہا ہے۔ سیاسی اور معاشی طور پر سیاہ فام آبادی کو مکمل کنٹرول میں رکھنے کی غرض سے "پاس سسٹم" جاری کئے گئے تاکہ ان کی آمد و رفت پر پابندی عائد کی جا سکے۔

نسل پرستی کی جس پولیسی پر جنوبی افریقہ عمل کر رہا ہے اس نے سیاہ فام اور سفید فام دونوں کو نسلی بنیادوں پر دو علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان کے رہائشی علاقے، تعلیمی ادارے، تفریحی پارک، سینما، پوسٹ آفس، ہسپتال، اور ہوٹل غرض

زندگی کے ہر میدان میں ان کو دور رکھا گیا ہے۔ سیاہ فام اکثریت کو کسی قسم کے سیاسی حقوق نہیں اور سیاسی طور پر وہ مکمل طور پر سفید فام حکومت کی رعیت ہیں۔ معاشی طور پر انہیں اس قدر کچل کر رکھا گیا ہے کہ ان کی بنیادی ضروریات مشکل سے پوری ہوتی ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں یوں تو بہت سے ظلم و ستم ہوئے ہیں۔ مگر جس غیر انسانی احساسات کے ساتھ نسل پرستی کی بنیاد پر جنوبی افریقہ میں سیاہ فاموں کو کچلا گیا ہے اس کی مثال بہت کم تاریخ میں ملتی ہے۔

ابتدائی تاریخ

1910ء میں جنوبی افریقہ میں برطانوی نوآبادیاتی حکومت کا خاتمہ ہوا اور برطانوی حکومت کے ماتحت جو چار علاقے جن میں کیپ، نٹال، اورنج اسٹیٹ، اور ٹرانسوال تھے ان پر مشتمل ایک یونین کا قیام عمل میں آیا۔

جنوبی افریقہ میں پہلے یورپی آباد کار سترہویں صدی میں آئے جنہوں نے آہستہ آہستہ یہاں پر قبضہ کرنے کی پولیسی پر عمل شروع کیا۔ انیسویں صدی تک برطانیہ نے اس علاقہ میں سیاسی و معاشی تسلط حاصل کر لیا اور مقامی باشندوں کو ان کی زمینوں اور جائدادوں سے بے دخل کر دیا اور انہیں ہزاروں کی تعداد میں "محفوظ علاقوں" میں منتقل کر دیا جو کہ ان ریاستوں میں واقع تھے کہ جن کے حکمرانوں نے یورپی حملہ آوروں کی مخالفت کی تھی۔

انیسویں صدی کے آخر میں جنوبی افریقہ میں معدنیات کی کانوں میں کھدائی شروع ہوئی۔ جن میں سونے اور ہیرے کی کانیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کانوں میں کام کرنے کے لئے سیاہ فام لوگوں کی ضرورت تھی۔ جنہیں محفوظ علاقوں سے مختلف انتظامی قوانین کے تحت سستی تنخواہوں پر زبردستی کام کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اسی زمانہ میں

چھوٹے کھیتوں کی جگہ بڑے بڑے کھیتوں کو تجارتی بنیاد پر چلانے کی ابتداء ہوئی۔ چونکہ مقامی سیاہ فام باشندوں نے ان کھیتوں میں کام کرنے سے انکار کر دیا اس لئے نٹال کے کھیت مالکوں نے اس مقصد کے لئے ہندوستان سے مزدوروں کو بلایا جو کہ بعد میں مستقل طور پر جنوبی افریقہ میں آباد ہو گئے۔ اس کے برعکس کیپ کے علاقہ میں پھلوں کے کھیتوں اور باغوں میں کام کرنے کے لئے ان زمین سے محروم لوگوں کو استعمال کیا جو کہ سابقہ غلاموں کی اولاد تھے۔

یونین حکومت نے نوآبادیاتی دور کی نسل پرستی کی پالیسی کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس کو سیاہ فام لوگوں کے لئے اور سخت بنا دیا۔ مثلاً 1913ء کے لینڈ ایکٹ کے ذریعہ، بہت سے محفوظ علاقوں کی زمینوں پر قبضہ کیا گیا اور نئے محفوظ علاقے بنائے گئے اور کسی افریقی کو یہ اجازت نہ دی گئی کہ وہ ان علاقوں سے باہر کوئی زمین خریدے یا اس پر قبضہ کرے۔ اب تک کچھ علاقوں میں سفید فام اور سیاہ فام دونوں مل کر حصہ داری کی بنیاد پر کھیتوں میں کام کرتے تھے مگر اس قانون کے بعد انہیں مکمل طور پر بے دخل کر دیا گیا اگرچہ حصہ داری کی شکل یہ ہوتی تھی کہ زمین اور بیج سفید لوگوں کے ہوتے تھے جب کہ کھیت میں کھیتی باڑی کا کام سیاہ فام مزدور کرتے تھے۔

اس ایکٹ سے یہ فائدہ ہوا کہ سفید فام کھیتوں کے مالکوں کو کھیت مزدور سستے ملنے لگے اور محفوظ علاقوں کو تحفظ دینے کی وجہ سے معدنیات کی کانوں میں کام کرنے والے مزدور آسانی سے دستیاب ہونے لگے۔

۱۹۱۰ء میں یونین کی حکومت کے پاس تمام سیاسی طاقت تھی۔ اس کے اراکین سفید فام اقلیت کے ذریعہ انتخابات میں منتخب ہوا کرتے تھے۔ اس وقت تین قسم کا ووٹنگ کا طریقہ رائج تھا۔ نٹال، ٹرانسوال اور اورنج۔ فری اسٹیٹ میں صرف سفید فام لوگ پارلیمنٹ کے اراکین کو ووٹ دے سکتے تھے۔ کیپ کے صوبے میں ووٹ کا حق صاحب جائداد لوگوں کو تھا۔ تیسرا نظام محفوظ علاقوں میں تھا۔ جن میں افریقیوں کو اپنی

روایتی پنچایت کے اراکین کو منتخب کرنے کا حق تھا مگر اس وقت تک یہ پنچایتیں اپنی سیاسی طاقت کو کھو چکی تھیں اور محض معمولی جھگڑوں کے فیصلہ کا اختیار رکھتی تھیں۔ اس طرح سفید فام باشندوں کے لئے ویسٹ منسٹر قسم کی پارلیمنٹ اور سیاسی ڈھانچہ برقرار رہا۔ جب کہ افریقی باشندے اس سے محروم رہے۔

لیکن جنوبی افریقہ کے سیاسی، سماجی اور معاشی ڈھانچہ میں اس وقت تبدیلی آنا شروع ہوئی جب کہ یہاں صنعتی دور کی ابتداء ہوئی۔ نئی صنعتوں اور کارخانوں میں سستی مزدوری کی ضرورت پڑی تو سیاہ فام باشندوں کو شہروں میں لایا گیا۔ خود سیاہ فام اپنے محفوظ علاقوں میں بدترین معاشی صورت حال سے دوچار تھے۔ آبادی کی زیادتی، رہائشی سہولتوں کا فقدان، ٹیکسوں کی بھرمار، اور معاشی ضروریات کی بڑھتی ہوئی خواہشات نے انہیں شہروں میں آنے اور فیکٹریوں میں کام کرنے پر مجبور کیا۔ اس کی وجہ سے نسل پرستی کی وہ قیود جو اب تک سختی سے قائم تھیں وہ بھی ٹوٹنا شروع ہوئیں۔ ملوں اور کارخانوں میں کام کرنے کے نتیجہ میں ان میں سیاسی شعور آیا اور ان میں اپنے استحصال کے خلاف مزاحمت کرنے کا احساس ہوا۔

جنوبی افریقہ کے سفید فام باشندوں نے اس عمل کو اپنے اپنے مفادات کے نقطہ نظر سے دیکھا۔ کارخانوں کے مالکوں اور تاجروں نے اس عمل کا خیر مقدم کیا کیونکہ اس صورت میں انہیں سستی مزدوری اور ان کی پیدا کردہ اشیاء کے خریدار مل رہے تھے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں سفید فام مزدور اور دست کاروں نے اسے اپنی روزی کے لئے خطرہ سمجھا۔ کیونکہ اب تک انہیں سستے مزدور آسان شرائط پر آسانی سے مل جاتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مل کر اس پر سخت احتجاج کیا اور شہری آبادی پر کنٹرول کا مطالبہ کیا۔ 1922ء میں اسٹیلارڈ کمیشن نے یہ رپورٹ دی۔

"مقامی باشندوں کو شہروں میں آنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے کیونکہ شہر سفید فام آبادی کے لئے ہیں۔ وہ صرف اس وقت یہاں پر آئیں جب کہ سفید آبادی کے کاموں

روایتی پنچایت کے اراکین کو منتخب کرنے کا حق تھا مگر اس وقت تک یہ پنچائتیں اپنی سیاسی طاقت کو کھو چکی تھیں اور محض معمولی جھگڑوں کے فیصلہ کا اختیار رکھتی تھیں۔ اس طرح سفید فام باشندوں کے لئے ویسٹ منسٹر قسم کی پارلیمنٹ اور سیاسی ڈھانچہ برقرار رہا۔ جب کہ افریقی باشندے اس سے محروم رہے۔

لیکن جنوبی افریقہ کے سیاسی، سماجی اور معاشی ڈھانچہ میں اس وقت تبدیلی آنا شروع ہوتی جب کہ یہاں صنعتی دور کی ابتداء ہوتی۔ نئی صنعتوں اور کارخانوں میں سستی مزدوری کی ضرورت پڑی تو سیاہ فام باشندوں کو شہروں میں لایا گیا۔ خود سیاہ فام اپنے محفوظ علاقوں میں بدترین معاشی صورت حال سے دو چار تھے۔ آبادی کی زیادتی، رہائشی سہولتوں کا فقدان، ٹیکسوں کی بھرمار، اور معاشی ضروریات کی بڑھتی ہوئی خواہشات نے انہیں شہروں میں آنے اور فیکٹریوں میں کام کرنے پر مجبور کیا۔ اس کی وجہ سے نسل پرستی کی وہ قیود جو اب تک سختی سے قائم تھیں وہ بھی ٹوٹنا شروع ہوئیں۔ ملوں اور کارخانوں میں کام کرنے کے نتیجہ میں ان میں سیاسی شعور آیا اور ان میں اپنے استحصال کے خلاف مزاحمت کرنے کا احساس ہوا۔

جنوبی افریقہ کے سفید فام باشندوں نے اس عمل کو اپنے اپنے مفادات کے نقطہ نظر سے دیکھا۔ کارخانوں کے مالکوں اور تاجروں نے اس عمل کا خیر مقدم کیا کیونکہ اس صورت میں انہیں سستی مزدوری اور ان کی پیدا کردہ اشیاء کے خریدار مل رہے تھے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں سفید فام مزدور اور دست کاروں نے اسے اپنی روزی کے لئے خطرہ سمجھا۔ کیونکہ اب تک انہیں سستے مزدور آسان شرائط پر آسانی سے مل جاتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مل کر اس پر سخت احتجاج کیا اور شہری آبادی پر کنٹرول کا مطالبہ کیا۔ 1922 میں اسٹیلارڈ کمیشن نے یہ رپورٹ دی۔

"مقامی باشندوں کو شہروں میں آنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے کیونکہ شہر سفید فام آبادی کے لئے ہیں۔ وہ صرف اس وقت یہاں پر آئیں جب کہ سفید آبادی کے کاموں

کمیشن کی رپورٹ کو 1923ء کے ایک قانون کے ذریعہ نافذ کیا گیا کہ جو افریقی شہر میں آتے تو اپنی آمد کی اطلاع دے۔ جو ملازمت وہ کر رہا ہے اس کا اندراج کرائے اور اگر اس کی ملازمت ختم ہو جائے تو اس کے بارے میں اطلاع دے جو افریقی شہر میں کوئی ملازمت نہیں حاصل کر سکے اسے پولیس شہر سے نکالنے کا اختیار رکھتی تھی۔ اس طرح اس قانون کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی گئی کہ دیہاتوں اور قصبوں سے آنے والے افریقیوں کو روکا جائے اور انہیں شہروں میں آباد نہیں ہونے دیا جائے۔

لیکن اس قانون پر سختی کے ساتھ اس وجہ سے عمل نہیں ہو سکا کہ کارخانے کے مالکوں کے مفاد میں یہ تھا کہ شہر میں سیاہ فام لوگوں کی آمد رہے تاکہ وہ سستے مزدور حاصل کر سکیں اور ان کی مزدوری کے حصول کی ضروریات کو پورا کر سکیں۔ ادھر خود افریقیوں نے اس کی مخالفت کی اور برابر شہروں میں آتے رہے۔ ان کی اس کوشش اور مزاحمت کو معاشی مفادات کے تحت قبول کر لیا گیا۔

انیسویں صدی تک جنوبی افریقہ کی معیشت معدنیات کی کانوں اور زراعت تک محدود تھی مگر پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ نئے صنعتی دور میں داخل ہوا۔ اس کو یہ موقع اس وجہ سے ملا کہ یورپی ممالک جنگ میں شمولیت کے بعد جنگی ساز و سامان اور اسلحہ بنانے میں مشغول ہو گئے اور روز مرہ ضرورت کی چیزوں کی سخت قلت ہو گئی اس وجہ سے جنوبی افریقہ نے ان اشیاء و مصنوعات کی پیداوار پر توجہ دی 1930ء کی دھائی میں جنوبی افریقہ جب عالمی سونے کے معیار سے نکلا تو اس کی معیشت کو اس سے فائدہ ہوا اور بجلی، بندرگاہ کی سہولتیں اور ریلوے کو بہتر بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی غیر ملکی سرمایہ جنوبی افریقہ کی معیشت میں بڑے پیمانہ پر لگایا گیا جس کی وجہ سے صنعتی طور پر اس نے ترقی کی۔ اس صنعتی ترقی نے مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کو ملازمتوں کے مواقع فراہم کئے اور ان میں بڑی تعداد سیاہ فام مزدوروں کی تھی۔

لیکن اس مرتبہ بھی کانوں اور کھیتوں کے مالکوں نے شہروں میں نئے آنے والے سیاہ فام لوگوں کی مخالفت کی اور اس کے نتیجہ میں آبادی کو روکنے کے لئے 1937 ء میں ایک قانون پاس ہوا جس کے تحت اگر کوئی مزدور ملازمت کے لئے شہر آتا ہے تو اسے صرف چودہ روز کی مہلت ہوگی کہ وہ کام تلاش کرے۔ اس کے بعد اگر اسے کام نہیں ملتا ہے تو اسے شہر کو چھوڑنا ہوگا۔ اگر کوئی مزدور شہر میں رہتا ہے تو اس کی بیوی کو اس کے ساتھ رہنے کے لئے پرمٹ کی ضرورت ہوگی۔ کوئی افریقی سفید فام علاقے میں زمین خریدنے کا مجاز نہیں تھا۔

افریقی باشندوں کو شہروں میں آباد ہونے سے روکنے اور ان پر کنٹرول کرنے کے لئے 1902 ء میں "ریفرنس بک" کا طریقہ شروع کیا گیا۔ قانون کے تحت یہ رکھا گیا کہ جس کے پاس یہ بک نہیں ہوگی وہ ملازمت کا اہل نہیں ہو سکتا۔ پنشن، پیسے کی ادائیگی، سکول کے داخلہ، مکان کی خرید و فروخت اور شہر میں چلنے پھرنے کے لئے ریفرنس بک لازمی تھی۔

بانتوستان پولیسی 1959-1973 ء

اس زمانہ میں نسل پرستی کو قائم رکھنے کے لئے سخت قوانین وضع کئے گئے اور اس بات کی مسلسل کوشش کی گئی کہ کس طرح سے ابھرتی ہوئی اور بڑھتی مزاحمت کو سختی کے ساتھ کچلا جائے۔ چنانچہ اسی کے نتیجہ میں 1960 ء میں شارپ ول کے مقام پر افریقی باشندوں کا قتل عام ہوا اور اسٹیٹ آف ایمرجنسی کے تحت نئے ظالمانہ قوانین کا نفاذ کیا گیا اور ہزاروں لوگوں کو بغیر مقدمہ چلائے جیلوں میں ڈالا گیا۔ وہ تمام جماعتیں جو نسل پرستی کی مخالف تھیں انہیں کالعدم قرار دے دیا گیا۔ سیاسی جلسے جلوسوں پر پابندی عائد کی گئی اور افراد کو جلاوطنی کے احکامات کے تحت خاموش کر دیا گیا۔ افریقی باشندوں کو سیاسی و سماجی اور معاشی طور پر کچلنے کے لئے ایک نئی پولیسی بانتوستان شروع کی گئی۔

جس کا مطلب تھا کہ افریقیوں کی ترقی کا علیحدہ پروگرام۔ لیکن یہ اصطلاح ایک دھوکہ دینے والی تھی۔ اس کی بجائے ہوا یہ کہ افریقیوں کو مزید کئی گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا اور بانتوستان بنا کر افریقیوں کے لئے علیحدہ سے محفوظ علاقے بنائے گئے۔ اس کی وجہ سے وہ افریقی کہ جن کی اس سے باہر زمینیں تھیں ان کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ ان کی زمین چھین کر انہیں محفوظ علاقوں میں دھکیل گیا۔

بانتوستان کا ایک بنیادی مقصد یہ تھا کہ ان علاقوں میں مقامی باشندوں کو محدود سیاسی اختیارات دیئے جائیں تاکہ وہ اپنے سیاسی مقاصد اور عزائم کو پھیلا نہ سکیں مگر تمام انتظامی امور کی پس پردہ طور پر مرکزی حکومت کی جانب سے کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ بانتوستان کی پولیسی کے تحت جنوبی افریقہ کی حکومت کی کوشش تھی کہ افریقیوں کو شہر میں آنے سے روکا جائے۔ بیروزگار لوگوں کو شہروں سے بانتو علاقوں میں بھیجا جائے، اور خوش حال علاقوں میں ان کی آمد پر پابندی لگائی جائے۔

نئے قوانین کے تحت شہروں میں عورتوں کی آمد پر پابندی لگائی گئی تاکہ افریقی بحیثیت خاندان کے شہر میں مستقل طور پر رہائش پذیر نہ ہو سکیں۔ افریقیوں کو شہر سے نکالنے کے لئے "سست و کاہل اور ناپسندیدہ عناصر" کے قوانین بنائے گئے جنہیں بغیر کسی وارنٹ کے گرفتار کیا جا سکتا تھا 1989 ۔ میں جسٹس ڈوکوٹ نے کہا۔

جب کوئی ایک بار سرکاری طور پر "کاہل و سست" قرار دے دیا گیا، تو اس کے ساتھ ہر قسم کا سلوک کیا جا سکتا ہے۔ اسے کسی دوسری جگہ بھیجا جا سکتا ہے، اسے مختلف جگہوں میں قید کیا جا سکتا ہے اور اس پر ہمیشہ کے لئے اس علاقہ میں پابندی لگائی جا سکتی ہے کہ جہاں پر اسے گرفتار کیا گیا ہے اور یا کہیں اور کسی جگہ جانے پر پابندی۔ بانتو علاقہ سے باہر رہنے کے تمام حقوق خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔"

بانتوستان کا واضح طور پر یہ مقصد تھا یہ ان لوگوں کے لئے بنایا جائے کہ جن کی زراعت اور صنعت میں کوئی ضرورت نہ تھی اور یہاں ایسے مزدوروں اور عورتوں کی

اکثریت ہو جو بے روزگار ہوں اور جنہیں کم تنخواہوں پر حسب ضرورت استعمال کیا جا سکے۔

1986-1973 -

ان تمام پابندیوں کے باوجود افریقی باشندوں میں اس استحصال کے خلاف مزاحمت کے رجحانات پیدا ہوتے جس کا اظہار انہوں نے اسٹرائکوں، مظاہروں اور تحریروں کے ذریعہ کیا۔ ۱۹۷۶ء میں جب سویٹو کے اسکول کے طلباء نے نسلی تعلیمی نظام کے خلاف احتجاج کیا تو اسے مسلح پولیس نے سختی سے کچل دیا۔ اس کے نتیجہ میں پورے ملک میں ایک سال تک مظاہرے اور اسٹرائکیں ہوتی رہیں۔ یہ مزاحمت 1960 ۔ کی دہائی کے بعد سے سب سے زیادہ شدید تھی جس نے حکومت کو مکمل طور پر ہلا کر رکھ دیا اور اس لئے سفید فام حکومت نے اپنی نسل پرست پولیسی کو دوبارہ سے نئے انداز میں تشکیل دیا۔ اس میں ان افریقی باشندوں کو جو شہروں میں رہ رہے تھے کچھ سیاسی و سماجی حقوق دے گئے مگر وہ تمام لوگ جو بانتوستان میں رہائش پذیر تھے انہیں شہروں میں آنے سے روک دیا گیا اور مجبور کیا گیا کہ وہ بانتوستان میں قائم ہونے والی صنعتوں میں کام کریں یا ان صنعتوں میں جو ان کی سرحدوں پر واقعہ ہیں ان صنعتوں میں ان کی اجرتیں شہروں کے مقابلہ میں بہت کم ہیں۔

اس نسل پرستی کی پولیسی کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ سفید فام برتر، ذہین اور مہذب ہیں جب کہ سیاہ فام افریقی غیر متمدن، کاہل، سست اور کم تر ہیں لہٰذا برتر نسل کو یہ حق ہے کہ وہ ان افریقیوں کو اپنے تسلط میں رکھ کر انہیں مہذب بنائیں۔

لیکن جنوبی افریقہ میں جو صنعتی تبدیلیاں آئیں۔ اس نے سفید فام اقلیت اور ان کی حکومت کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنے نسلی ڈھانچہ میں تبدیلی لائیں۔ صنعتوں کے قیام کے بعد بڑی تعداد میں مزدوروں، صنعت کاروں اور فنی ماہرین کی ضرورت تھی
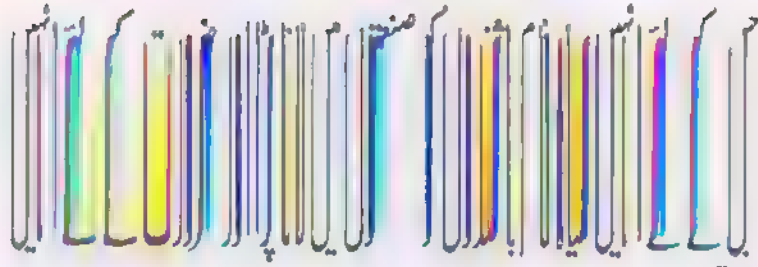
فنی تعلیم بھی دی۔ یہیں سے افریقیوں کی سیاسی تربیت شروع ہوئی۔ ان کی ٹریڈ یونین بنیں اور پھر سیاسی جماعتیں تشکیل ہونا شروع ہوئیں۔ جتنی حکومت کی جانب سے سختی ہوئی اتنی ہی مزاحمت بڑھتی چلی گئی اور آج صورت حال یہ ہے کہ افریقی باشندوں میں سیاسی شعور بڑھ چکا ہے اور وہ اپنے حقوق کی جنگ شدت کے ساتھ لڑ رہے ہیں اور عالمی میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی وجہ سے ان کی سیاسی جدوجہد پوری دنیا میں اپنے ہمدرد پیدا کر چکی ہے۔

آئرلینڈ اور نسل پرستی

مائک پین فولڈ

نسل پرستی کا تعلق محض جلد کے کالے ہونے پر نہیں بلکہ اس کا بنیادی تعلق طاقت پر ہے، اس لئے آئرلینڈ کے کیلٹک نسل کے لوگوں کو انگریزی اقتدار کا جو تجربہ ہوا ہے وہ کالوں کے تجربات سے کم نہیں، وہ آئرلینڈ کو ایک پس ماندہ ملک سمجھتے ہیں اور آئرلینڈ کے باشندوں کو سست، کاہل اور بیوقوف گردانتے ہیں۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ نے آئرلینڈ کا معاشی طور پر استحصال کر کے اسے پس ماندہ بنایا اور پھر ان کی غربت اور مفلسی کی وجہ سے ان کو نااہل قرار دیا۔

تاریخ

آئرلینڈ برطانیہ کی سب سے پرانی نو آبادی ہے اور اس کی معاشی ترقی مکمل طور پر برطانوی مفادات سے جڑی ہوئی ہے۔ الزبتھ اول سے لے کر ولیم آف اورنج کے عہد تک تمام امرا۔ اور لارڈوں کو ان کی شاہی خدمات کے سلسلہ میں آئرلینڈ میں جاگیریں اور زمینیں دی جاتی تھیں۔ چونکہ ان امرا۔ کی اکثریت غیر حاضر زمینداروں کی ہوتی تھی اس لئے ان کی جائدادوں کی حفاظت کے لئے یہاں پر فوج کا ہونا لازمی تھا، ویسے بھی مذہبی طور پر آئرلینڈ کے لوگ کیتھولک تھے جب کہ اہل برطانیہ پروٹسٹنٹ، اس لئے انہیں

اپنے مذہبی مفادات کے تحفظ کے لئے بھی فوج رکھنا ضروری تھی۔

لیکن اس کے علاوہ بھی برطانیہ کو آئرلینڈ کی ضرورت تھی، سرولیم پیٹی، جو ایک ماہر معاشیات تھا، اس نے سترہویں صدی میں ایک منصوبہ بنایا کہ جس کے تحت آئرلینڈ کو مویشیوں کے پالنے کے ایک بڑے باڑے میں تبدیل کر دیا جائے جو کہ برطانیہ کی گوشت کی غذائی ضروریات کو پورا کر سکے، اس مقصد کی تکمیل کے لئے آئرلینڈ کی زائد آبادی کو دوسری نو آبادیات میں بسا دیا جائے۔ اس منصوبہ سے برطانیہ کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آئرلینڈ کو اپنی غذائی ضروریات کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے اور آئرش لوگوں کو ایسا ہی سمجھتے تھے کہ جیسے کوڑا کرکٹ کہ جنہیں جہاں چاہیں پھینک دیا جائے۔

برطانیہ کے صنعتی انقلاب نے اناج کی ضرورت کو اور بڑھا دیا اور اس کو پورا کرنے کے لئے آئرلینڈ پر مزید بوجھ ڈالا گیا۔ انگریز اور آئرش جاگیرداروں کو اناج کے قانون کے تحت اناج کی اجارہ داری دے دی گئی اور یہ قانون اس وقت واپس لے لیا گیا کہ جب شمالی امریکہ سے سستا اناج درآمد کیا جانے لگا۔ اس وجہ سے جاگیرداروں نے یہ سوچا کہ مویشیوں کو پالنا اناج کی کاشت سے زیادہ منافع کا سودا ہے، لہٰذا ایک مرتبہ پھر چراگاہوں کی خاطر لوگوں کو بے گھر کیا گیا۔ 1843ء میں ڈیون کمیشن نے یہ فیصلہ کیا کہ برطانیہ کے لئے زیادہ اناج پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ چھوٹے چھوٹے پلاٹوں کو بڑے پلاٹوں میں ضم کر دیا جائے، لیکن اس منصوبہ پر عمل درآمد ہونے میں تقریباً ایک ملین لوگوں کو اجاڑنا ضروری تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر کیوں آئرلینڈ کا قحط برطانیہ کے لئے فائدہ مند ہوا۔

آلوؤں کا قحط

1846ء اور 1847ء میں آلوؤں کی 8 فصلیں خراب ہو گئیں کیونکہ آئرلینڈ کی

اکثریت ان پر انحصار کرتی تھی۔ اس لئے خراب فصلوں کی وجہ سے وہ بھوکوں مر گئے۔ مرنے والوں کی تعداد کو ایک سے دو ملیون تک بتایا جاتا ہے اور تقریباً ایک ملین ہجرت کر کے چلے گئے اور آئرلینڈ کی آبادی گھٹ کر آدمی رہ گئی (اس تباہی کے بعد سے آئرلینڈ کبھی نہیں سنبھل سکا۔ قحط سے پہلے اس کی آبادی ۸۔۵ ملیون تھی۔ آج یہ آبادی ۴۔۵ ملیون ہے)

آئرلینڈ کے قحط کے بارے میں برطانوی نقطہ نظریہ تھا کہ یہ ملک بنجر تھا اور اس کی بڑھتی آبادی صرف ایک فصل پر انحصار کرتی تھی اور وہ تھی آلوؤں کی فصل، کہ جس کے خراب ہونے کے امکانات ہمیشہ زیادہ ہوتے تھے۔ لیکن صورت حال اس سے مختلف تھی۔ ہر سال آلوؤں کی خرابی کے باوجود آئرلینڈ کم از کم 15 ملیون پاؤنڈ قیمت کی غذا برطانیہ کو برآمد کرتا تھا۔ 1846ء میں اس کی قیمت بڑھ کر 41 ملیون پاؤنڈ ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مویشی اور اناج تو برآمد کیا جاتا تھا، اور کھانے کی چیزیں درآمد کی جاتی تھیں۔ آئرش اس بات پر مجبور تھے کہ محض آلوؤں پر گزارا کریں، کیونکہ ان کی زمینوں پر برطانوی جاگیردار قابض تھے اور وہ وہاں وہ فصلیں کاشت کرتے تھے کہ جن کی ضرورت اہل برطانیہ کو تھی۔ لہٰذا برطانیہ کے اقتدار کے زمانہ میں انہیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ صرف ایک فصل پر بھروسہ کریں اور ان کی قوت خرید اس قدر کم کر دی گئی کہ وہ اس قابل ہی نہیں رہے کہ کھانے کی دوسری اشیاء خرید سکیں۔ اس لئے یہ برطانوی منصوبے تھے کہ جن کے نتیجہ میں یہ قحط آیا۔

اس قحط پر برطانوی پریس میں جو رد عمل ہوا اس کی مثال اس بیان سے دی جا سکتی ہے۔ "انگریز درحقیقت محنتی لوگ ہیں، وہ سستی کے بجائے ایمان داری اور محنت کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن کیلٹک قبائل جو اپنی سستی اور متلون مزاجی کی وجہ سے ہر جگہ مشہور ہیں، ان میں آئرش سب سے زیادہ کاہل اور متلون مزاج ہیں اگر انہیں یقین ہو کہ وہ بغیر کام کی وجہ سے زندہ رہ سکتے ہیں تو وہ بالکل کام نہیں کریں گے۔"

برطانیہ کا مشہور اخبار "دی ٹائمز" لکھتا ہے کہ "ایک انگریز کس لئے پیدا ہوا ہے؟
کام کرنے کے لئے۔ اور ایک آئرش کس لئے پیدا ہوا ہے؟ اس لئے کہ وہ اپنے گھر کے
دروازہ کے سامنے بیٹھ جائے اوکونیل کی تقریریں پڑھے اور انگریزوں کو گالیاں دے۔"
جب ایک ملیون آئرش ہجرت کر گئے تو برطانیہ میں اس پر خوشی کا اظہار کیا گیا اور کہا
گیا کہ۔ "کیلٹ چلے گئے۔ اپنے انتقامی جذبہ کے ساتھ چلے گئے۔ خدا کا احسان مند ہونا
چاہئے۔"

فوجی کاروائیاں

اوپر دئے گئے بیانات سے یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ انگریز آئرش کو انسان ہی
نہیں سمجھتے تھے، اس لئے جب بھی موقع ملا انگریز فوج نے آئرلینڈ والوں کا قتل عام کیا
اور انہیں بری طرح سے کچلا۔ فوج کے جذبات آئرلینڈ والوں کے اتنے خلاف تھے کہ
انہوں نے برطانوی حکومت کو کسی پر امن سمجھوتہ پر تیار نہیں ہونے دیا۔

معاشی پسماندگی

اگرچہ آئرلینڈ کو تیسری دنیا کے ملکوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا، مگر معاشی طور پر یہ
برطانیہ کے مقابلہ میں پس ماندہ ہے۔ سترہویں صدی سے اس قسم کے قوانین بنائے گئے
کہ آئرلینڈ میں ایسی صنعتوں کو نہ لگایا جائے جو کسی بھی حیثیت میں برطانوی صنعتوں کا
مقابلہ کر سکیں۔ جب شمال مشرقی آئرلینڈ میں صنعتی انقلاب آیا تو اس وقت، بہترین اور
اعلیٰ ملازمتیں وفادار پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگوں کو دی گئیں۔ شمالی آئرلینڈ کی صنعتوں کا
پہلی جنگ عظیم میں زوال ہوا جس کے نتیجہ میں آج تک وہاں بیروزگاری سب سے بڑا
مسئلہ ہے۔ 1920ء میں تقسیم کے بعد بھی دونوں آئرلینڈ کے حصوں میں کوئی معاشی
ترقی نہیں ہو سکی اور اب دونوں حصوں کو یورپی امداد ملتی ہے اور ان دونوں کو بغیر کسی
مبالغہ کے نئی نوآبادی کہا جا سکتا ہے۔

شمالی آئرلینڈ حقیقت میں برطانیہ کا ایک حصہ نہیں بلکہ اس کی کالونی ہے۔ یہاں " پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" پر عمل کرتے ہوئے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کو لڑایا جارہا ہے۔ اگرچہ برطانوی حکومت نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا ہے کہ کیتھولک فرقہ کے لوگوں کے ساتھ ملازمتوں اور مکان کی سہولتوں میں جانبداری برتی جارہی ہے مگر اس کے باوجود ان کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔ اگرچہ پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگ کیتھولک کے مقابلہ میں دوگنے ہیں۔ مگر بیروزگاری کیتھولک فرقہ والوں میں سب سے زیادہ ہے۔ یہ سب سے زیادہ گندے علاقوں میں رہتے ہیں اور ان میں پیشہ ور لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مخالفت

آئرلینڈ کے مسئلہ پر برطانیہ میں ان کے خلاف رائے ہمیشہ مخالفانہ رہی۔ یہ ضرور ہوا کہ کبھی کبھی انسانی بنیادوں پر ان کے ساتھ ہمدردی بھی کی گئی مگر صرف چند لوگوں نے۔ کرومویل سب سے زیادہ ان سے نفرت کرتا تھا اور اس نے ڈروگیڈا کے قتل عام کی اجازت دی تھی۔ اس کے بارے میں اس نے لکھا تھا " ہماری کوششوں کو خدا بنظر تحسین دیکھے گا۔۔۔ اگرچہ شہر میں تین ہزار مضبوط دشمن ہیں۔۔۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے 30 بھی جان بچا کر بھاگ سکیں گے اور جو بچ بھی جائیں گے تو وہ حفاظت کے ساتھ بارباڈوس پہنچا دیئے جائیں گے۔ میں اس کا قائل ہوں کہ میرا فیصلہ ان بدمعاش وحشیوں کے سلسلہ میں خدا کی مرضی کے مطابق ہے۔ "

1727 میں گلیورز ٹریولز کے مصنف سوفٹ نے آئرلینڈ کے بارے میں لکھا کہ۔ " آئرلینڈ کی آمدنی کا ایک تہائی حصہ انگلستان پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اگر اس میں ملازمت، پنشن اور اپیل کے منافع کو شامل کرلیا جائے تو یہ مملکت کی آدھی آمدنی ہو جاتی ہے۔ اور ہم سے جو پیسہ لیا جاتا ہے اس میں ہمارا خون پسینہ شامل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ

ہمارے کپڑے، مکانات، سب پر ہی ٹیکس لگتا ہے۔ اس طرح ہم برطانیہ کے فقیروں سے بھی زیادہ خراب زندگی گزارتے ہیں۔"

1792ء میں اس نے طنزیہ طور پر آئرلینڈ کے معاشی مسائل کا حل اس طرح بیان کیا تھا کہ آئرلینڈ کے غریب بچوں کو موٹا کر کے ان کا گوشت منڈیوں میں فروخت کیا جائے "مجھے ایک جاننے والے امریکی نے اس بات کا یقین دلایا کہ ایک سال کا صحت مند بچہ جس کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کی گئی ہو۔ اس کا گوشت بہت لذیذ اور خوش ذائقہ ہوتا ہے... میرا خیال ہے کہ یہ غذا بہت مہنگی نہ ہوگی اور اس لحاظ سے ہمارے جاگیردار صاحبان کے لئے موزوں ہوگی کیونکہ وہ پہلے ہی سے والدین کو ہضم کر چکے ہیں اور اب ان کے بچوں کے لئے ان کا یہ عمل بہترین ہوگا۔"

آئرش لوگوں کے بارے میں حقارت آمیز رویہ جاری رہا۔ فلسفی ہیوم نے آئرش لوگوں کے بارے میں لکھا کہ وہ تجسس اور نئی چیز کو جاننے کی دوسری اقوام یورپ کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اس نے ان لوگوں کو وحشی کہا کہ جو قدیم توہمات میں گھرے ہوتے ہیں۔ ان خیالات کے بعد ان لوگوں پر برطانوی اقتدار کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ آئرش لوگوں کے ساتھ یہ نسلی تعصب وقت کے ساتھ ختم نہیں ہوا۔ بلکہ آج بھی موجود ہے۔

غلامی اور نسل پرستی

ڈاکٹر مبارک علی